بجنگ آمد
کرنل محمدؐ خان

جنگ آمد

کرنل محمدؐ خان

انتساب

اُن تمام سیکنڈ لفٹیننوں کے نام

جو

کبھی تھے، آج ہیں

یا

آئندہ ہوں گے

”جہاں رہو خوش رہو“

قولِ عارف

فہرست

حناء سرناخن

ضِلع جہلم کے سنگلاخ، نیلے بھُورے کوہستانوں میں سِمٹی اور پھیلتی ہوئی وادی، جس میں کرنل مُحمّد خان پیدا ہو کر پروان چڑھے ہیں، ایک خاص وضع و انداز کے "مُحمّد خانوں" کی سرزمین ہے۔ یہ حساب تو مُجھے معلوم نہیں کہ مُحمّد خان اوّل نے کس زمانے میں اس دھرتی پر قدم رکھا تھا، البتّہ گردشِ ایام کی رکاب تھام کر جتنی دُور بھی پیچھے کی طرف دوڑ سکا ہوں، ہر پُشت کا پیشہ سپہ گری نظر آتا ہے۔ زراعت میں ملی ہوئی سپہ گری۔ اپنی مخصوص روایات میں دھن کا یہ دَھنوان خطّہ، جیالے سپاہی، جی دار کاشتکار اور جہانِ گندم وجو کے تابدار شگوفے پیدا کرنے کے لیے صَدیوں سے مشہور و ممتاز چلا آتا ہے۔ آج بھی یہاں کا ہر مُحمّد خان، قریب مُحمّد خان اوّل ہی کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہی تندرست و توانا مُحمّد خان جس کا ایک ہاتھ ہل کی ہتھّی پر رہتا ہے اور دوسرا قبضۂ شمشیر پر۔ جو گبھرو ہونے پر یا علی کا نعرہ لگا کر پہلے عموماً "پڑ کوڈی" کے لمبے

چوڑے "پڑوں" اکھاڑوں میں دُھومیں مچاتا ہے اور پھر وردی پہن کر "ڈھول سپاہی" کے رُوپ میں وطنِ عزیز کے مقدّس پرچم کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے۔ بانکا، جرّی، جیالا!۔۔۔ سخت جان و سخت کوش!۔۔۔۔اگر گھروں کی پیشانی پر "ماٹو" لکھنے کا رواج ہوتا تو اِس وادی کے اُونچے نیچے، کچّے پکے ہر گھر کے دروازے پر نظیری کا یہ مِصرع مرقوم ہوتا۔

کسَے کہ کشتہ نہ شُد از قبیلۂ مَانیست!

مگر یہ شیر دِل لوگ "ماٹو" لکھنے کے بجائے اپنے خُون سے زندگی کی تاریخ لکھنے کے قائل ہیں۔ شعر و ادب کا اُفق یہاں ہمیشہ ہی سے کچھ دُھندلا دُھندلا سا رہا ہے۔ قبائے عِلم و ہنر یہ لوگ کم ہی پہنتے ہیں۔ پہنتے بھی ہیں تو جسم کے اُوپر نہیں پہنتے، رُوح کے اندر پہنتے ہیں۔ کرنل مُحمّد خان، اِنہیں میں سے ایک ہیں۔ ماحول یا وِرثے کے اعتبار سے اِن کے ادیب بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، مگر وُہ جو علّامہ اقبال نے کہا ہے۔ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حِنا بندی!۔۔۔ تو ہمارے دوست مُحمّد خان کی شخصیت کی تشکیل کو فِطرت ہی کی "حِنا بندی" کا مُعجزہ سمجھنا چاہیے۔

چنانچہ اِن کی ذات میں دو الگ الگ، لیکن اپنی اپنی جگہ پر بھرپور شخصیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا مُحمّد خان! کم سُخن و کم آمیز!۔۔نہ ادائے کافرانہ، نہ

تراشِ آذرانہ!۔۔ کھیت میں جٹ جائے، تو چٹانوں سے جوئے شِیر کھینچ لائے۔ تلوار اُٹھا لے تو نہنگوں کے نشیمن تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ وطن کا مان، مِلّت کی آبرو!

دُوسرا مُحمّد خان وُہ ہے کہ اِس سادے مُرادے دیہاتی نام سے اُس کے ذہن و فِکر کی شادابی اور بُرّاقی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادیب اور اِنشا پرداز مُحمّد خان ہے۔ نرم دمِ گُفتگُو، گرم دمِ جستجو! چمن مشرب، بہار ایجاد!۔۔ خوش دِل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں!

مَزے کی بات یہ ہے کہ دونوں مُحمّد خان ایک دُوسرے کی نفی نہیں، تائید کرتے ہیں۔ ایک دُوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں، کیوں کہ دونوں کی جڑیں ایک ہی مٹّی میں پیوستہ ہیں۔ مُحمّد خان سپاہی ہو، کاشتکار ہو، ادیب ہو، دوست داری اور مہر و محبّت میں دونوں یکساں گرمجوش ہیں۔ اخلاص و تحمّل میں فرد اور انکسار کا تو یہ عالم کہ۔۔۔ نہ حَد اس کے پیچھے نہ حَد سامنے!

دُوسری جنگِ عالمگیر شروع ہوئی، تو علاقہ دَھنی کا یہ نیم لفٹین، اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہو گیا، لیکن یونیورسٹی کی اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود ہنوز ہل اور تلوار والا مُحمّد خان ہی تھا۔ ایک مُدّت تک بَصرہ اور شائبہ، بغداد اور مُوصل، قاہرہ اور طبروق میں گھُومنے کے بعد جب وُہ اپنے وطن میں واپس آیا تو ایک محمّد خان کے جسم

پر مَیدانِ جنگ کے تمغوں کی قطار سجی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ صلاحیت کا وقار اور بانکپن رَوشن تھا۔ یہ وُہ مُحمّد خان تھا جو اب کرنیل کی وَردی میں نظر آتا ہے، لیکن اِس عرصے میں اُس کے اندر ادیب مُحمّد خان بھی بیدار ہو کر بالغ ہو چکا تھا۔ ادیب مُحمّد خاں الف لیلیٰ کی گلیوں اور مِصر کے بازاروں اور شام کیارہ کے صحراؤں سے ایک بھرپور سانولی سلونی اجنبی زندگی کے موتی رول لایا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں، ستارے اور مُسکراہٹیں! ایک سیلابِ بہار، جس میں:

رِند جو ظرف اُٹھالیں وُہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وُہی مے خانہ بنے

"بجنگ آمد" میں اِنہیں خوابوں، رنگوں، ستاروں اور مُسکراہٹوں کی بارات فروزاں نظر آتی ہے۔

اِس کتاب کی اِشاعت اُردُو اَدب کے اہم واقعات میں سے ہے۔ جس وُسعت اور دِلی گرمجوشی کے ساتھ اِس کی پذیرائی ہوئی ہے، وُہ اُردُو کی بہت کم کتابوں کے حِصّے میں آئی ہے۔ مُشتاق احمد یوسفی، ابنِ انشا، سید عابد علی عابد، صفدر مِیر، مُشفق خواجہ اور صدیق سالک اور کتنے ہی دُوسرے اہلِ نظر اور اہلِ کمال نے جس انداز سے اس تخلیق پر دادو تحسین کے پھُول نچھاور کیے ہیں، وُہ ہر مصنّف کے لیے قابلِ رشک اعزاز ہے، مگر یہ

کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ”بجنگ آمد“ نے اُردُو اَدب کو مزاح کے ایک بالکل نئے اُفق کی تازہ ہوا اور کشادہ فضا سے آشنا کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے لیے بیش بہا مُسرّتوں کا خزینہ اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ کرنل مُحمّد خان کو ظرافت تک پہنچنے کے لیے کسی تمہید کا ”پُل“ نہیں باندھنا پڑتا۔ نہ وُہ قہقہوں کے ”جزیرے آباد“ کرتے ہیں۔ واقعات کی گردن میں لطافت کی بجتی ہوئی گھنٹیاں بھی وُہ آویزاں نہیں کرتے۔ اُن کا لطیف اور لچکیلا مزاح اُن کے اسلوبِ تحریر کا جزو ہے، اُن کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔ ان کی ظرافت کسی دلاویز خیابان میں ہنستی، مُسکراتی، گُنگُناتی ہوئی ندّی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اور اپنے بہاؤ کے طِلسم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

اِنسانوں کی طرح کتابیں بھی قِسمام قِسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ”بزرگ کتابیں“، ”نادان کتابیں“ وغیرہ وغیرہ۔ ”بجنگ آمد“ ایک ”دوست کتاب“ ہے یعنی ایسی کتاب جس پر دِل ٹوٹ کر آ جائے۔ جس کے ساتھ وقت گزار کر آدمی دِلی راحت محسوس کرے۔ جس سے بار بار گُفتگُو کرنے کو جی چاہے۔ دوست، جو خوش رُو بھی ہے، خوش مذاق بھی۔ شوخ بھی ہے اور دِلنواز بھی۔ ذہین بھی اور فطین بھی اور ہنس مُکھ اتنا جب دیکھیے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی سی!

یہ ”بجنگ آمد“ کی دُوسری آمد ہے جس میں مصنّف نے اپنے ترکش کے بعض نئے تِیر بھی شامل کر دیے ہیں اور اس کی صوری تزئین میں ہمارے مُلک کے نامور اہلِ قلم اور

مکتبۂ اُردُو ڈائجسٹ کے خوش ذوق مہتمم جناب الطاف حَسن قُریشی نے آسُودگی خیال و نظر کا جو اہتمام کیا ہے وُہ بجائے خود داد کا مُستحق کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اچھّی تو تھی ہی، اب پہلے سے زیادہ خوبصُورت بھی ہو گئی۔

اور اَب دیکھیے کرنل مُحمّد خان کا اندازِ گُل افشانیٔ گُفتار!

سید ضمیر جعفری

۳۱مارچ۱۹۶۸ء

۳۱-ڈی سیٹیلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

مقدمہ

یہ کوئی ایسی معرکہ آرا یا اِنقلاب آور قسم کی کتاب نہیں کہ اس پر مقدمہ دائر کیا جائے اور دراصل مقدمے کے بغیر ہی چھپنے جارہی تھی کہ ہمارے ایک ٹیڑی مزاج دوست ریحان مرزا خفقان تشریف لے آئے اور مسوّدہ دیکھ کر کسی قدر طنزاً فرمانے لگے:

”تو یہ کتاب آخر چھپ کر رہے گی؟“

عرض کیا: ”کوئی اعتراض؟“

بولے: ”دو ہیں۔ ایک تو آپ فوجی ہیں، دُوسرے آپ کا نام بھی کاشتکارانہ سا ہے۔ جب کام اور نام کا یہ عالم ہو تو لوگ بجا طور پر پُوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب نویسی کا اشتغال

کیسے آ گیا۔ یعنی کیوں نہ اس کی بجائے ایک مورچہ کھود ڈالا یا دو چار بیگھے زمین جوت لی؟"

پھر خود ہی رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہنے لگے:

"چلو، تمہارا فوجی ہونا تو رَن کچھ کے صدقے معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن نام کا کچھ علاج کرنا پڑے گا۔"

عرض کیا: "آپ کی تشخیص ہے۔ آپ ہی علاج تجویز فرمائیں۔"

بولے: "علاج آسان ہے۔ اِسی نام کے آگے پیچھے یا درمیان کوئی پیارا سا اَپ ٹُو ڈیٹ نام چپکا لیں۔ مثلاً انجم، ارم، سحاب، سرخاب، سروش، سنتوش وغیرہ وغیرہ۔"

مَیں ابھی دِل ہی دِل میں مُحمّد سنتوش خاں کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ خفقان صاحب بولے۔ "لیکن پُرانے نام کی مرمّت سے بھی کیا فائدہ؟ اسے سِرے سے ترک کر کے ایک دَم ماڈرن نام کیوں نہیں رکھ لیتے؟ مثلاً شمشاد عِشرت، ارشاد شمیم، ریاض طلعت، فردوس نسیم وغیرہ وغیرہ۔"

خفقان صاحب تو مشورہ دے کر تشریف لے گئے، لیکن ہمیں سوچتا چھوڑ گئے اور سوچا ہم نے یہ کہ خفقان صاحب کے تجویز کردہ نام ماڈرن تو ضرور ہیں، لیکن ہیں ذرا مشکوک

سے۔ یعنی ان سے نَر مادہ کا ہی پتہ نہیں چلتا اور چل بھی جائے، تو ہر وقت کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں اُٹھتے بیٹھتے یا انگڑائی لیتے جنس میں ہی خلل نہ آ جائے، چنانچہ ہر چند کہ ہمیں صنفِ لطیف کا احترام منظور ہے، بالفعل ہمیں صنفِ غیر لطیف میں ہی رہنے کا شوق ہے اور محض فیشن کی خاطر اپنا مردانہ مُستقبل مخدوش نہیں کرنا چاہتے، لیکن خفقان صاحب کے اِس سوال کا جواب دینا مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا اشتعال کیسے آیا۔

خفقان صاحب قبلہ، وہ یوں آیا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میجر مسعود احمد[۱] مدیر "ہلال[۲]" نے اپنے اخبار کے ایک خاص شُمارے کے لیے کچھ لکھنے کو کہا۔ ہم نے جلد بازی میں نہ صرف وعدہ کر لیا، بلکہ اپنے علم و فضل کی تیز روشنی سے قارئین "ہلال" کی آنکھیں خیرہ کرنے کے لیے اپنے موضوع کا بھی اعلان کر دیا۔ یعنی "تعمیرِ کردار میں اقتضائے بشریت کی بُوقلمونیاں۔" لیکن بعد میں لکھنے بیٹھے تو عنوان کی تابناکی سے ہماری اپنی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ لکھ نہ سکے۔ تاریخِ وعدہ قریب آتی نظر آتی، تو ہمیں غیب سے ایک ایسا موضوع

---

۱ اب لیفٹینینٹ کرنل مسعود احمد ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز۔

۲ دفاعی افواج کا ہفتہ وار مجلّہ جو اس وقت روزنامہ تھا۔

سوجھا جو ہمارے کام اور شاید نام سے بھی مناسبت رکھتا تھا، یعنی یہ کہ ہم "لفٹین کیسے بنے۔"

یہ ایک طرح کا ادبی مورچہ ہی کھودنا تھا۔ چنانچہ ہم نے دماغ اور پٹھّوں کی مشترکہ مدد سے سوچا اور اپنے زورِ قلم اور زورِ بازو کے طفیل ایک مضمون بعنوانِ "لفٹینی" لکھ ڈالا۔ جو "ہلال" میں شائع ہو گیا۔ یہی مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ چند ماہ بعد "ہلال" کا ایک اور خاص نمبر چھپنے لگا تو مدیرِ "ہلال" نے پھر یاد فرمایا۔ اب کے ہم نے دیانتداری سے کام لیا اور اقبال کر لیا کہ "ہمارے پاس ایک ہی موضوع تھا جو کام آ چکا ہے اور اب ہمارے اندر مزید مضمون نگاری کا مادّہ ختم ہو گیا ہے۔" لیکن جنابِ مدیر ہنس کر کہنے لگے:

"وُہ موضوع ختم ہونے والا نہیں، لفٹینی سیکھنے کے بعد اُسے استعمال بھی کیا ہو گا، بس ترکیبِ استعمال پر ہی کچھ لکھ دو۔"

سوچا تو یاد آیا کہ کچھ کیا تو تھا، چنانچہ وہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو باب ۲)

اس کے بعد نہ "ہلال" کے خاص شماروں میں کمی آئی اور نہ ہماری لفٹینی کے کارناموں میں، حتیٰ کہ جنگ ختم ہو گئی۔ اب جو دیکھا تو ہمارا اعمال نامہ مرتّب ہو چکا تھا۔ فرشتوں سے تو پہلے ہی کہاں چھُپا تھا۔ اب اِنسانوں کی نظروں میں بھی آ گیا۔ سوچا کہ اب یہ

حکایت عام ہوئی ہے۔ اب پردہ کیسا؟ اسے ایک جگہ جمع کر دو۔ آگے چل کر دائیں ہاتھ میں ملے گا، یا بائیں ہاتھ میں کم از کم وزن کا اندازہ تو ہو جائے۔

خفقان صاحب نے دو خاص اعتراضوں کے علاوہ جاتے جاتے ایک عام حکمت کا موتی بھی بکھیرا تھا کہ جس کتاب کا کوئی MESSAGE یعنی پیغام نہ ہو اُس کا چھپنا بیکار ہے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ کتاب لکھتے وقت ہم اپنی پیغامبرانہ ذمّہ داریوں سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ ہمارے ذہن میں تو ایک ہلکی پھلکی لفٹینی بیتی تھی اور ہمیں گمان تک نہ تھا کہ ہم نسلِ انسانی کو کوئی ملکوتی قِسم کا پیغام پہنچا رہے ہیں، بلکہ لکھنے کے دوران ہمیں کچھ احساس تھا تو فقط یہ کہ ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں؛ چنانچہ خفقان صاحب کے جواب میں ہمارا فوری فیصلہ تو یہی تھا کہ ہمارا کوئی "میسج" نہیں، لیکن ذرا غور کرنے پر ایک واقعہ یاد آ گیا جس سے شُبہ ہونے لگا کہ ہماری کتاب شاید بالکل بے پیغام بھی نہیں۔

ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست اِس کتاب کا ایک باب "ہلال" میں پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پڑھنے کے دوران آپ ایک دو مرتبہ مُسکرا دیئے۔ اس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور وُہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گُزرے تو علمِ ریاضی کی رُو سے لازم آتا ہے کہ مُلک میں مُسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہو گا اور مُسکراہٹوں کا جو توڑا ہمارے مُلک میں ہے اُس کا تو آپ کو

عِلم ہی ہو گا۔۔۔ بیورلی نکلز(BEVERLY NICHOLS) نے اپنی کتاب VERDICT ON INDIA میں لکھّا ہے کہ برِّصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دُوسرے مُلکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ سوچتا ہوں کہ اگر اکثر خواتین و حضرات کی توجہ دُوسرے مشاغل سے ہماری کتاب کی طرف بَٹ جائے تو نہ صرف فی مربع میل ناخوشی میں کمی کا اِمکان ہے، بلکہ شاید فی مربع میل آبادی بھی گھٹنے لگے۔ بہر حال آبادی بڑھے یہ گھٹے۔ کتاب کا پیغام ضرور ہے اور یہ وہی مشہور پیغام ہے جو ایک عارف افیونی نے ایک کم عارف افیونی کو صرف چار لفظوں میں دیا تھا۔ دونوں دوست ترنگ میں جارہے تھے کہ کم عارف افیونی کنوئیں میں لڑھک گیا۔ عارف نے دوست کو غائب پایا تو چلّایا:

"کہاں ہو دوست؟"

کنوئیں سے فریاد اُٹھی: "یہاں ہوں۔"

عارف نے فی البدیہہ پیغام دیا:

"اچھّا دوست، جہاں رہو خوش رہو۔" اور آگے چل نِکلا۔

یہ کتاب ایک لفٹین کی جنگ بیتی ہے۔ اس میں تصوّف، فقہ یا عِلم الکلام پر دیدہ دانستہ کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس میں صِرف اُن باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لفٹینوں کو اپنی

زندگی، خصوصاً جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ اکثر جوان ہوتے ہیں اور جوانوں کے پہلو میں دِل ہوتا ہے۔ وُہی دِل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں پہنچ کر سنگ و خِشت بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو چُبھتے ہیں حالانکہ خود اِن بزرگوں نے بھی جوانی میں اِنہی زاویوں پر خم کھایا ہوتا ہے۔ بہر حال اُن محترمین کی خِدمت میں پیشگی گزارش ہے کہ اِس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قِصّہ ہے وہاں عیش و سرور کی باتیں بھی ہیں۔ جہاں زہد و تقویٰ کا ذکر ہے وہاں ناؤنوش کے قصّے بھی ہیں۔ جہاں رکوع و سجود کا بیان ہے، وہاں رقص و سرود کی داستان بھی ہے اور جہاں مردانِ اصیل کے کارنامے ہیں، وہاں زنانِ جمیل کے سرنامے بھی ہیں۔۔۔۔ اِس تمام این و آں کے باوجود اگرچہ بظاہر اِس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو غلط راہ پر ڈال دے، تاہم قارئینِ گرامی، اگر آپ نے بچپن (۵۵) سال مکمّل کر کے سرکاری طور پر بزرگی حاصل کرلی ہے تُو مناسب ہے کہ مطالعہ میں اِحتیاط برتیں۔ یعنی پڑھتے پڑھتے اگر آپ کی بزرگی پر کسی قِسم کا دباؤ پڑنے لگے، تو لازم نہیں کہ کتاب ختم کر کے ہی دَم لیں، کتاب فوراً بند کر دیں۔ خود اس خاکسار نے بزرگوں کی لکھّی ہوئی کئی کتابیں شروع کیں، مگر دیباچے سے آگے نہ گُزر سکا اور کتاب کو اَدب سے طاق پر رکھ کر دیوانِ غالب کھول لیا۔۔۔ آپ اس کی جگہ بہشتی زیور یا پکی روٹی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔۔۔ یوں بھی زندگی کی ایک منزل پر پہنچ کر غیر آزمودہ کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں۔

کل کلاں اِن کتابوں سے نکیرین نے کوئی ایسا سوال پُوچھ لیا جس کا آپ سے جواب نہ بن پڑا، تو بخشش میں ناحق پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ جواب سیکنڈ لیفٹینٹ نسبتاً آسانی سے دے سکتے ہیں، سو اگر آپ کسی وقت فوج میں رہ چُکے ہوں یا کسی فوجی سے محبّت کی ہے یا فقط صحبت ہی رہی ہے تو آپ کے لیے عُمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ جب چاہیں یہ کتاب بے کھٹکے پڑھ سکتے ہیں۔ اِنشا اللہ آپ نکیرین کے اِمتحان میں کوئی سوال ایسا نہ پائیں گے جو سلیبس سے باہر ہو۔

اگر دیباچوں پر یقین کیا جائے تو شائد ہی کوئی کتاب ایسی ہو گی جسے مصنّف نے برضا و رغبت چھپوایا ہو۔ کتاب لکھی تو کسی نہ کسی طور جاتی ہے لیکن جب تک مصنّف کے دوست رشتہ دار اور جملہ تاجرانِ کتب اُس کے پاؤں نہ پڑیں، کتاب چھپنے میں نہیں آتی، بلکہ مشتاقانِ کتاب کا اصرار سالہا سال جاری رہتا ہے تا آنکہ مصنّف آخر مروّت میں آکر ایک دن کڑوا گھونٹ پی کر کتاب چھپوانے پر راضی ہو جاتا ہے۔ قاعدے کی رُو سے "بجنگ آمد" کی طباعت کی داستان بھی کچھ یوں ہونا چاہیے تھی کہ جونہی کتاب کا آخری باب لکھّا گیا، دوست احباب اپنا کام چھوڑ کر ہمارے آگے دست بَستہ آ ملتجی ہوئے کہ خُدارااَب قوم پر احسان کرو اور اسے زیورِ طبع سے آراستہ کر ڈالو۔ جواب میں ہم نے پس و پیش کیا، تو وُہ ایک وفد کی صُورت مقامی ایم-این-اے کی سرکردگی میں ہمیں محضر نامہ پیش کرنے آئے۔ ایک تیز طبع دوست نے بھُوک ہڑتال کر دی۔

دُوسرے نے سر پھوڑ لیا، چنانچہ آخر اِس ڈر سے کہ اِن آبگینوں کو کہیں ایسی ٹھیس نہ لگ جائے جو قابلِ دست اندازی پولیس ہو، ہم نے جی کڑا کر کے کتاب چھپوانے کی حامی بھر لی۔۔۔ لیکن حضرات حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی واردات پیش نہیں آئی۔ کتاب چھپوانے کا فیصلہ ہم نے تنِ تنہا کیا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اِس کے چھپنے میں کسی کے چوٹ نہیں آئی۔

دیباچوں کے آخر میں ایک سِکّہ بند جملہ ہوتا ہے کہ اگر قارئین نے اِس فقیر کی تصنیف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا، تو فقیر کو اطمینان ہو گا کہ پُر تقصیر کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میرے خیال میں یہ فقیر کی چالاکی ہے، بلکہ اِنکسار میں لپٹی ہوئی دہشت انگیزی ہے۔ دراصل فقیر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ خبردار جو کتاب پسند نہ کی ورنہ انجام بخیر نہ ہو گا۔ قاری عالی مُقام! آپ پر اِس کتاب کو پسند کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر آپ کو پسند آگئی تو ظاہر ہے کہ آپ معقول آدمی ہیں۔ اور اگر پسند نہ آئی، تو بھی آپ کا قصُور نہیں۔ صرف ایک بات واضح ہو جائے گی کہ آپ نہ کبھی لفٹین تھے، نہ اب ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے۔ اور لفٹین نہ ہونا بھی کوئی بُنیادی عیب نہیں۔ آپ ماشاءاللہ ٹھیکے دار ہو سکتے ہیں، جاگیر دار ہو سکتے ہیں۔ کارخانہ دار ہو سکتے ہیں اور اگر واقعی ہیں۔۔۔ تو اللہ آپ کی بِکری زیادہ کرے۔۔۔ آپ کتابیں پڑھیں ہی کیوں؟ کتابیں پڑھیں آپ کے مُنشی!

آخر میں ہمیں چند احباب کا ذکر کر لینے دیں جو اس کتاب کے محاذ پر ہمارے دوش بدوش شریک جنگ رہے اور ذکر کرنا ہے ہمیں:

- محمد اکرم کا جنہوں نے مسوّدہ ٹائپ کر کے ثابت کر دیا کہ بد خطی لاعلاج مرض نہیں۔

- ماجد صدیقی اور مونس زبیری کا جنہوں نے ٹائپ شُدہ مسوّدے کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ تزئین بھی کر دی۔

- کرنل شفیق الرحمٰن اور میجر سید ضمیر جعفری کا جو فوجی ادیبوں کے سالاروں میں سے ہیں اور جنہوں نے باکمال سپاہی پروری اِس رنگروٹ کی بھی رہنمائی کی اور نہ صرف فون پر کتاب کی مزاج پُرسی کرتے رہے، بلکہ ایک دومَرتبہ بنفسِ نفیس اس کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا اور از راہ اشک شوئی فرمایا کہ صحّت بُری نہیں۔

- کرنل مسعود احمد کا جنہوں نے ابتدائی اِشتعال کا کفارہ اِس طرح ادا کیا کہ اِن بے وضع اوراق کو اپنے حُسنِ تدوین سے کتاب بنا دیا اور آپ کو پیش کرنے کی جرائت اور رخصت بخشی۔

- مخدومی و مکرمی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا جن کے قدموں میں بیٹھ کر اُردُو لکھنا

سیکھا۔ اگر اسکول میں ہمیں ایسا شفیق اور صاحبِ ذوق استاد نہ مِلتا تو ہم دیسی صاحب بہادروں کی طرح ٹیڑھے مُنہ سے نیم غلط انگریزی بولنا تو شاید سیکھ لیتے، لیکن اپنے قومی اَدب کے ذَوق سے محروم رہتے اور خُدایا! کتنی بڑی نِعمت سے محروم رہتے۔

○ اور عزیز قاری، آپ کا جو پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ آپ کے پہلو میں ایک زندہ اور جوان دِل ہے۔ مَیں نجومی تو نہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ سال اچھّا ہے۔

مُحمّد خان

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

مقدمہ ثانی

جناب ناشر کا ارشاد ہے کہ بجنگ آمد کے چھٹّے ایڈیشن کی طباعت کے موقع پر کچھ لکھوں۔

عرض ہے کہ بحیثیتِ مصنّف مجھے خوشی ہے کہ کتاب کا چھٹا ایڈیشن ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قارئین نے اسے شرفِ قبول بخشا ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی کتاب کی مقبولیت لازماً اس کی معقولیت کی سند نہیں۔۔۔ کہیں اچھّی کتابیں پہلے ایڈیشن سے آگے نہیں بڑھیں۔۔۔ لیکن قبولِ عام بہر حال قُدرت کا عطیہ ہے اور اِس کی تحقیر کفرانِ نعمت ہے۔

سب سے بڑی نعمت جو یہ کتاب میرے لیے اپنے لائی ہے وہ بیشمار اور بے بہا نئے دوست ہیں۔ ان میں سے کئی تو اِس قدر قریب آگئے ہیں کہ سوچتا ہوں یہ نہ ہوتے تو زندگی کس قدر بے رنگ ہوتی۔ لیکن ہزاروں اَن دیکھے دوست بھی ہیں: وہ جو کبھی دو

پیار کس لفظ لکھ بھیجتے ہیں۔ لیکن بیشتر وہ جو کچھ کہے بغیر دل ہی دل میں یاد کر لیتے ہیں۔۔۔ مُجھ جیسے بے مایہ شخص کے لیے اِس سے بہتر کیا انعام ہو سکتا ہے؟ کسی غنی کے لیے بھی اِس سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے؟

ویسے جہاں تک کتاب کی اصل قدر و قیمت کا سوال ہے، وہ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے اور محترمہ بیگم بھٹی کا جنہوں نے ہمیں ڈیل کا خط لکھا ہے:

"محترم کرنل صاحب

آپ نے بجنگ آمد لکھ کر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بیٹا جاوید جو کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔ اب ہر وقت بجنگ آمد میں محو ہوتا ہے۔ جاوید ماشاء اللہ بڑا قابل بچّہ ہے۔ اِس سال چوتھی جماعت کا امتحان دے رہا ہے!

کیا ہی اچھّا ہو اگر آپ دو چار اور ایسی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اُردُو میں بچّوں کے لٹریچر کی سخت کمی ہے۔

آپ کی ممنون

بیگم بھٹی"

اب دوسری ماؤں سے بھی درخواست ہے کہ اپنے ہونہار بچّوں سے مشورہ کر کے اِس خاکسار کے حق میں دُعائے خیر کریں اور مناسب ہدایت جاری فرمائیں کہ اگلی کتاب لکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

مُحمّد خان
بَل کسر۔۔ ضلع جہلم
۱۵ نومبر ۱۹۷۲ء

گزارش

بجنگ آمد اور میری دُوسری کتابوں کو اتفاق سے وُہ قبول عام نصیب ہوا کہ ناشروں نے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع کر دیے لیکن ان کے حسنِ کتابت وطباعت پر وُہ توجہ نہ دے سکے جس کی یہ مستحق تھیں۔ بالخصوص میرے پچھلے ناشر نے تو میری تینوں کتابوں (بجنگ آمد۔ بسلامت روی - بزم آرائیاں) کو کمپیوٹر کے نئے نئے استعمال سے اس عجلت میں شائع کیا کہ اکثر صفحات کتابت کی غلطیوں سے بھر گئے جو اہلِ ذوق کو بہت گراں گزرے اور متعدد قارئین نے گلہ کیا۔

اسی دوران دوست پبلیکیشنز اسلام آباد کی کتابیں میری نظر سے گزریں اور میں ان کے حسنِ طباعت اور معیار سے بہت متاثر ہوا۔

میری دو کتابوں، بجنگ آمد اور بزم آرائیاں کا معاہدہ (الگ الگ جلدوں میں یا کلیات کی شکل میں) پچھلے عشرے اگست ۱۹۹۶ء میں ختم ہو چکا ہے۔ نئے معاہدے کے مطابق

اب ان دونوں کتابوں کے حقوق اِشاعت دوست پبلیکیشنز کے پاس ہیں۔

محمّد خان

عِشق لفٹینی و مُشکلہا

ہمیں ہٹلر سے ہمیشہ یہ شکایت رہے گی کہ اُس نے دُوسری جنگِ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا۔ یہ نہیں کہ ہم موصوف کو اس کارِ خیر سے روکنے کی کوشش کرتے۔ ہم فقط اعلانِ جنگ میں دو مہینے کا التوا چاہتے تا کہ اپنی تعلیم پوری کر لیتے، لیکن ہم بمشکل گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر کالج پہنچے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالا بالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی، جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاصا گہرا اثر پڑا۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں ہر چند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دُوسرے ہمسائے جرمن بمباروں اور ٹینکوں کے درمیان ایسی پر سکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے،

تاہم باقی دنیا بفضلِ خدا خیریت سے تھی اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان [1] میں تو انگریز کی برکت سے اس شدّت سے امن برپا تھا کہ شیر بکری مع جملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے۔ چنانچہ صلح و آشتی کے اس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ عین اس وقت ملک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتدا ہورہی ہے، یعنی لاہور میں ایک نوجوان کالج چھوڑ کر جنگ میں کود پڑنے پر تُل گیا ہے۔۔۔ یہ نوجوان میں ہی تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دِل آزاری مقصود تھی نہ انگریز کی دلجوئی۔ ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔۔ ہمیں صرف لفٹین [2] بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے مل کر اس شوق کی تکمیل کا سامان پیدا کر دیا تھا، چنانچہ ہم نے فوج میں کمیشن کے لیے درخواست دے دی۔

ان دونوں ابھی وُہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آج کل سلیکشن بورڈ کہتے ہیں۔ انٹرویو تو خیر ان دنوں بھی ہوتے تھے، بلکہ ایک چھوڑ تین تین، لیکن نہایت شریفانہ

---

[1] اس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

[2] لیفٹیننٹ

قسم کے۔ ایک بزرگ سا جرنل اور پھر نیم بزرگ سے بریگیڈیر اور کرنل بیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے کرسی پر امیدوار کو بٹھا دیا جاتا تھا اور پھر اس سے نہایت بے ضرر سوال پوچھے جاتے تھے۔

آپ کا نام کیا ہے؟

تعلیم کہاں تک ہے؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہر چند کہ کچھ خاندانی اسرار فاش کرنا پڑتے تھے، لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ اُٹھائے نہ اُٹھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا پھلکا اور خاصا مفرح قلب سا انٹرویو ہوتا تھا۔ ان دِنوں نہ تو امیدواروں کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی تھی، نہ اُن کے لاشُعور کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ بدعتیں چند سال بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ ہمارے دو انٹرویو جہلم اور پنڈی میں ہوئے اور ہم کامیاب رہے۔ آخری انٹرویو کے لیے حکم ملا کہ فلاں تاریخ شملہ حاضر ہو جاؤ۔ یہ سُن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انٹرویو میں کامیابی نصیب ہو جائے تو انسان فی الفور لفٹین

بن جاتا ہے اور با قاعدہ لفٹینی کرنے لگتا ہے۔ اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انٹرویو اور لفٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا مہلک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک نیم لفٹینی کے عالم میں شِملہ روانہ ہوئے اور جب انٹرویو ہو چُکا تو ہمیں محسوس ہوا کہ اَب کسی لمحے سالم لفٹین ہوئے۔ کیونکہ انٹرویو تسلّی بخش قِسم کا ہوا تھا۔ ہم میں کوئی ایسی بُنیادی خامی بھی نہ تھی۔ تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھّی تھی۔ ہمارے خاندان کی فوجی خِدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی، لیکن ہم نے شجرۂ نسب کو تھوڑا سا کھینچ تان کر اس قدر صُوبیدار چچوں اور کپتان چچازادوں کا اِحاطہ کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد کچھ بچ بھی گئے تھے۔ بہر حال یہ راز ہمارے اور خُدا کے درمیان ہی تھا۔ پولیس کی طرف سے صفائی کی بھی شرط تھی، تو ہم یوں بھی کبھی امنِ عامہ میں مُخل نہیں ہوئے تھے، لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں، لہٰذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پُورا کر دیا تھا۔

شِملے سے گھر پہنچے تو لفٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اِدھر چند عُجلت پسند بزرگوں نے ہماری لفٹینی کے اعزاز میں پیشگی دعوتیں دینا شروع کر دیں۔ جنہیں ہم واجبی برخورداری مگر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے۔ آخر ایک دن ڈاکیہ کھُلا تار لے کر آیا اور دُور ہی سے بولا۔ ”لفٹین صاحب، لفٹینی مبارک ہو۔“

لیکن تار پڑھا تو فقط اِتنا لکھا تھا "تمھیں او-ٹی-ایس[۳] مہو میں ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ۱۸ اگست ۱۹۴۰ء کو حاضر ہو جاؤ۔"

یہ پڑھ کر کچھ مایوسی تو ہوئی، لیکن پھر سوچا کہ آخر لفٹینی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ یوں اُٹھا کر بانٹ دی جائے۔ اِس کے کچھ ادب آداب سکھانے ہوں گے، کچھ خفیہ گُر بتانے ہوں گے کہ لفٹینی چلائی کیسے جاتی ہے، چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رُخصت ہوئے۔ ہر طرف سے لفٹین صاحب کہہ کر پُکارا جارہا تھا جو ہمیں بے حد گوارا محسوس ہونے لگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست و برخاست اور لَب و لہجہ سے بھی لفٹینی ٹپکنے لگی۔

ریل کے سفر کے لیے درجہ اوّل کا ٹکٹ مِلا۔ یہ بھی ہماری عالیجاہی کی علامت تھی۔ ٹکٹ دیکھنے والے ڈبّے میں داخل ہوئے تو سر کہہ کر خطاب کرتے۔ خُدا جانے انہیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں، لفٹین ہے۔ بہرحال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانے درجے کے سرکاری مُلازم سے کرنا چاہیے۔ ہم سفروں میں انگریز بھی تھے۔ یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے۔ "معاف کیجئے گا۔" اور پھر عرضِ مُدعا کرتے۔ ہمیں نہ صرف اپنی لفٹینی کا یقین ہو گیا۔ بلکہ اس کی بلندی کا بھی

---

۳ او-ٹی-ایس سے مراد آفیسر ٹریننگ سکول ہے جو ابتدائے جنگ میں مہو (وسط ہند) میں کھولا گیا تھا۔

احساس ہونے لگا۔ چنانچہ دِلّی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لفٹینوں کی تعداد کافی ہوگئی، تو موضوعِ گفتگو زیادہ تر یہی رہا کہ لفٹینی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتّفاقِ رائے اس بات پر ہوا کہ معمولی فرق ہے، چنانچہ رتلام اور مہو کے درمیان ہمارا مزاج عرشِ مُعلّٰی سے کچھ ہی اِدھر تھا، بلکہ کئی ایک تو دبی زبان سے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ دانوں نے نپولین کو کیوں سر چڑھا رکھا ہے!

آخر مہو کا اسٹیشن آگیا۔ توقّع تھی کہ ہمارے استقبال کے لیے فوج کا دستہ آئے گا، بینڈ ہو گا، موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لیے دروازہ کھولیں گے اور با ادب با ملاحظہ ہمیں اپنے بنگلوں تک پہنچا دیں گے، لیکن دیکھا تو یہاں کا بندوبست کسی قدر مختلف نظر آیا۔ استقبال کے لیے آدمی تو تھے، لیکن اِن میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی۔ گاڑی رُکی تو ہمارے ڈبّے میں ایک گورا داخل ہوا جس کے بازو پر تین سفید دھجیاں لگی تھیں۔ آتے ہی بولا:

"اگر اس ڈِبّے میں کوئی کیڈٹ ہے، تو ابھی مَت باہر نِکلے۔"

ہم بیٹھ تو گئے، لیکن اس گورے کی زبان بے حَد کھُردری لگی۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ سُن کر کچھ تشویش سی ہوئی کہ ہم سے کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ لفٹین تو لفٹین ہوا، یہ کیڈٹ کیا جنس ہے؟ چنانچہ ہمیں ذرا پُختہ سا شُبہ ہونے لگا کہ اِن انگریزوں نے لفٹینی سے

وصل کی کچھ خُفیہ شرطیں بھی ٹھہرا رکھّی ہیں جن سے ہمیں پہلے آگاہ نہیں کیا گیا۔

جب اسٹیشن دُوسرے مسافروں سے خالی ہو گیا تو گورا پھر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا گُستاخانہ سا حکم دیا۔ باہر نکلے تو دُوسرے ڈبّوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلتے دکھائی دیئے۔ اسٹیشن پر تین چار اور گورے بھی موجود تھے۔ اِن میں سے ایک جو بظاہر سینئر تھا، اچانک چلایا:

"سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں۔"

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دُوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دِلی سے قطار بھی بنالی۔ گورا پھر چیخا:

"دائیں سے ایک دو تین بولو۔"

ہم نے حکم کی تعمیل تو کی، لیکن محسوس ہوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایاں نہیں۔ آخر ہم رنگروٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے۔ بہر حال ہمیں تین ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورا بولا:

"باہر تین ٹرک کھڑے ہیں، ہر ٹولی ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے۔"

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو، ہمیں ٹرکوں میں لے جانا

شدید غلطی بلکہ بے اَدبی ہے، موٹر کاریں ہونا چاہیے تھیں، مگر سوچا کہ اِن معمولی ٹامیوں سے اُلجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا، چنانچہ ہم نے قُلیوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گورا گرج کر بولا:

"کیا کہا، قُلی؟ تم فوجی اسکول میں آئے ہو۔ ہسپتال میں نہیں۔ اپنا سامان خود اُٹھاؤ، ٹرکوں میں لادو اور اُوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو۔ سمجھے؟"

سمجھ تو آگئی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی، لیکن ہم سب نے حتیٰ المقدور جلال میں آکر اِس بے اَدب ٹامی کو گھرے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فوجی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جونہی لفٹین ہو گئے اِس گُستاخ گورے کا کورٹ مارشل کر دیں گے۔ اِس دلیرانہ فیصلے پر ہر طرف سے مرحبا کی صَدا اُٹھی۔۔۔۔ اِس وقت ہم کورٹ مارشل کو مارشل لاء کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے۔۔۔ اور گورے کے مستقبل کو دِل ہی دِل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

منزلِ مقصُود کی جھلک توقعات سے بہت غیر مشابہ تھی۔ ہماری جائے قیام کے خدوخال بنگلے کی نسبت جیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی، تنگ و تاریک اور طویل، جس کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چارپائیاں پڑی تھیں اور چارپائیوں پر ہمارے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا

لگا۔ گورا جیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا:

"یہ تختیاں گلے میں لگانے کے لیے نہیں، محض تمہاری نشستوں کے تعین کے لئے ہیں۔ اب اپنی اپنی چارپائیاں ڈھونڈ لو اور اپنا سامان وہاں اُٹھا کر لے جاؤ۔"

ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ سامان اُٹھانے اور چلنے پھِرنے میں چُستی دکھاؤ اور شور مَت کرو۔

ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا۔ ہم نے پُرانے فوجیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ لفٹین لوگ ہر وقت گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں زبان بندی کا حکم دینا چھوٹے منہ کی بہت بڑی بد تمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے: "اِن جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لفٹین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے۔" لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مُناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اِختیار کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔

شام ہوئی تو کھانے کے لیے Mess میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں سے لفٹینی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے ڈرائنگ رُوم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مؤدب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کئے۔ اِس خوشگوار ماحول میں ہم نے اسٹیشن اور بارک کے اُن ناخوشگوار واقعات کو بھُلا دیا جو اُن گھٹیا خاندان کے گوروں سے سرزد ہوئے تھے اور ایک سرور کے عالم میں باہم گِٹ پِٹ

گِٹ پِٹ کرنے لگے۔ اِتنے میں دو خوش لباس انگریز داخل ہوئے۔ یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے، لیکن اِن کے بازوؤں پر تین دھجیاں نہ تھیں، بلکہ کندھوں پر پیتل کے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ افسر تھے اور وُہ سارجنٹ۔ اِن کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ انہیں دیکھا، تو فخر سا محسوس ہوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگ مگ کرتے ستارے اُبھرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لیے گئے۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اُردُو بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نو آموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اُسی طرح ہمارا انگریزی ”مٹر گوشت“ بھی ہمارے اناڑی چھُری کانٹوں کی زَد میں نہ آتا تھا۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلافِ شان تھا۔ لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا؛ لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے، تو اُردُو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے۔ اِسی طرح جہاں انگریزی چھُری کانٹے سے کام نہ چلتا، ہم آنکھ بچا کر اُنگلیوں سے ہی بوٹی اُچک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اُردُو مَیں کھا لیتے۔ بعض حضرات البتّہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اُتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کہ چھُری کانٹا لیے پلیٹ میں

مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے !قِصّہ مُختصر، پیشتر اس کے کہ اِن مومن مٹروں کو کوئی گزند پہنچتا، بیرے پلیٹیں اٹھا کر چل دیئے اور لفٹین صاحبان اپنا سا مُنہ اور چھُری کانٹا لے کر رہ گئے۔۔۔ بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے، اس کے ساتھ سلوک کیا کرنا ہے، چنانچہ کانی آنکھ سے اُن انگریزوں کو دیکھتے اور پیچھے اُن اماموں کے چمچے اور کانٹے اُٹھا کر رکوع و سجود میں جاتے۔

کھانا ختم ہوا تو اینٹی روم میں آئے اور کافی کا دَور چلا، لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز کپتان اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ خوشگوار مجلس برخاست ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے در چشمِ زدن صُحبتِ یار آخر شُد۔ وہاں سے اُٹھ کر بارک میں واپس آئے، تو وہی بد زبان گورا پہلے سے موجود تھا۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"کل صُبح سات سو بجے پی-ٹی[۴] کے میدان میں حاضر ہونا ہے۔ لباس، بنیان، نِکّر اور ربڑ کے جوتے۔"

اور اتنا کہہ کر اکڑتا ہوا چل دیا۔ گویا یہ گورا باز نہیں آ رہا تھا۔ وہی حرکتیں کرتا تھا جو

---

[۴] فزیکل ٹریننگ یعنی ورزش

لفٹینی کے منافی تھیں۔

کسی نے پوچھا۔ "ارے یار، یہ سات سو بجے کس بلا کا نام ہے؟"

ایک صاحب بولے: "بے معنی بات ہے۔ گورا انگریزی غلط بولتا ہے۔"

ایک فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا "اِس کے معنی ہیں صُبح سات بجے۔"

دِن بھر کے تھکے تھے۔ صُبح تیار ہوتے ہوئے ہم سے کئی ایک پی ٹی کے لیے سات بجے سے ایک دو منٹ بعد پہنچے۔ کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی شِکن آجاتی، تو لمحے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہو جاتی تھی، لیکن اِس گورے نے جو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا، تو کچھ اِس انداز سے چلّایا، گویا بھونچال آ گیا۔ رہیں اُس کی پیشانی کی شِکنیں، تو ان کی اصلاح کے لیے استری کی بجائے روڈ رولر درکار تھا۔ معلوم ہوا کہ گورا محض پھَٹ ہی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے، لیکن اس کی انگریزی اُس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ گورے کے الفاظ تو خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن ان کی تاثیر ہمارے دلوں میں آناً فاناً سرایت کر گئی۔ کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی لفٹینی بتدریج زائل ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پی ٹی شروع ہوئی۔ پہلے تو ہمیں میدان کے اِرد گرد دوڑایا گیا یعنی ڈبل کرایا گیا۔ (ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر جھکنے کا حکم مِلا جو فطرت کی منشاء کے سراسر خلاف تھے۔ کوئی آدھ پَون گھنٹے کی پی ٹی کے بعد ہم تسخیرِ فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے، لیکن ہماری اپنی ترکیبِ عناصر میں خاصا خلل آ گیا۔

آخر پی ٹی ختم ہوئی اور حکم ہوا کہ ناشتہ کے بعد پھر یہیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا۔ فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صُبح کے ساڑھے نو بجے مُراد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کھلا کہ یہ گورا کمپنی سارجنٹ میجر ہے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لیے سخت مُضر ثابت ہوتی ہے۔

ناشتے کے بعد جب میدان میں پہنچے، تو سارجنٹ میجر کو غیر حاضر پایا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وُہ غیر حاضر نہیں، ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اِس قدر زود اثر نِکلی۔ صحیح وقت پر سارجنٹ میجر نمودار ہوا، تو اپنی فتح پر ذرا سا مُسکرایا، لیکن فوراً منجمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ کوارٹر ماسٹر سٹور میں جا کر اپنے اپنے سائز کے بُوٹ لے آؤ۔

بُوٹ دیکھے تو محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وُہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں کے

لیے زیادہ موزوں ہے اور جب پہن کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے ناںگا پربت گھسیٹ رہے ہیں۔ فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا کہ اِن بوٹوں کے ساتھ تو ڈبل بھی کرنا پڑے گا۔ یہ سُنا تو تمام سلسلۂ قرا قرم سَر پر آ پڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صَرف ہو گئے اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط پی ٹی ہوئی، لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بُوٹ پٹی پہننا سیکھ لیا، تو با قاعدہ ڈرِل شروع ہوئی۔

ڈرِل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری TURN-OUT یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا، گویا ہمیں خُردبین کے نیچے رکھ دیا۔ وُہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیانہ قابلیت کا فرشتہ بھی نہ دیکھ پاتا، یا دیکھ بھی لیتا تو نظر انداز کر دیتا۔ ہم نے ڈرِل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بُوٹ، پٹی، نمبر، بٹن، پیٹی، فلیش وغیرہ دکھالی تھی، لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا:

”کیڈٹ نمبر ۱۵، کالر پر ایک سفید ذرّہ INCORRECTLY DRESSED۔

سزا: تین ایکسٹرا ڈرِل۵۔"

سارجنٹ میجر نے جو کاپی پنسل لیے کمپنی کمانڈر کے ارشادات قلمبند کر رہا تھا، فوراً ہمارے اعمال نامے میں ہماری سزا کا اِندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا۔ حتّٰی کہ بیچارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو بظاہر پیدا ہی یونیفارم میں ہوئے تھے۔

اِس کے بعد ڈرِل شروع ہوئی اور خُوب تیزی اور تُندی سے حکم ملنے لگے:

"سیدھے دیکھو۔ چھاتی باہر۔ ٹھوڑی اُوپر۔ بازو ہلاؤ۔ ہالٹ۔ ہلو مَت۔ مکّھی مت اڑاؤ۔ ہنسو مَت۔" وغیرہ وغیرہ۔

اِن سب میں "ہلو مَت" کے حکم پر عمل کرنا عذابِ عظیم تھا۔ سیدھے بُت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھُجلی محسوس ہوتی ہے۔ اَب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے۔ کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منشائے سارجنٹ نہیں۔ عین اس وقت ایک مکّھی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ مکّھی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دِل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن

---

۵ ایکسٹرا ڈرل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، معمولی لغزشوں کی سزا کے طور پر پچھلے پہر کرائی جاتی تھی۔ یعنی جب دوسرے لوگ تفریح میں مشغول ہو جاتے تھے۔ خاصی عذاب ناک چیز تھی۔

سارجنٹ سے آنکھ بچانا کراماً کاتبین سے آنکھ بچانا ہے۔ مکھّی پر دست درازی کا خیال آتا ہے، تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اپنی کاکنی[٦] انگریزی میں چلّا اُٹھتا ہے "DONT KILL NO FLY" یعنی مکھّی مَت مارو۔ ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھّی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔۔۔۔ ایسے اِشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صِرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھُجائیں اور بالآخر جب ڈرِل ختم ہوتی اور ہم بلاخوفِ تعزیر کانوں کو چھُو سکتے اور مکھّیوں کو اُڑا سکتے، تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھّی اُڑانا بھی کسی قدر عظیم عیاشی ہے، بلکہ اِسی خوشی میں وُہ آبلے بھی بھُول جاتے جو ان آہنی بوٹوں کے اندر ہی بنتے اور پھوٹتے تھے۔

لیکن اِس بے دریغ ڈرل کا ایک پہلو ضرور تھا جس نے اِس کی درشتی کو گوارا کر دیا تھا اور وُہ تھی سارجنٹوں کی لامتناہی پھبتیاں، جو وُہ بے بس کیڈٹوں کی حرکات پر کستے تھے۔

---

٦ لندن کے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان

سارجنٹوں نے نسلاً بعد نسل اِس موضوع پر ایک بسیط و دلپذیر لٹریچر چھوڑا ہے جو اپنی تابکاری کی وجہ سے زیورِ طبع سے تو شاید کبھی آراستہ نہ ہو گا، لیکن اِس ادبِ عالیہ کے تلف ہونے کا بھی ایسا خطرہ نہیں، کیونکہ یہ شہ پارے بیشمار سپاہیوں کے توانا سینوں میں محفوظ ہیں۔ ایک دن ڈرِل کرتے ہوئے میرے ساتھ کے کیڈٹ نے پھُرتی سے دو تین غلطیاں کر دیں۔ تیسری غلطی پر سارجنٹ کا رنگ پہلے لال، پھر پیلا اور بالآخر نیلا ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے جہاں کھڑا تھا وہیں رُک گیا۔ پھر باقی دُنیا و مافیہا سے قطع نظر کرتے ہوئے خطا کار کیڈٹ کی طرف بڑھا۔ جب سارجنٹ اور کیڈٹ کا درمیانی فاصلہ صفر تھا۔ یعنی دونوں کی ناکیں چھُو رہی تھیں، تو سارجنٹ الفاظ پیس پیس کر اپنے شکار سے یوں مخاطب ہوا:

"مَیں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، ضبطِ تولید سراسر جائز معلوم ہونے لگتا ہے۔"

ہنسی کے بے پناہ ریلے سے ہمارے مُنہ کھُلنے ہی والے تھے کہ سارجنٹ کے مُنہ سے "ہنسو مت" کا ایٹمی دھماکہ بر آمد ہوا۔ ہم نے دانت تو بھینچ لیے، لیکن ہماری اندرونی کیفیت وُہ ٹائر ہی سمجھ سکتا تھا جس کے پھٹنے میں تھوڑی سی مزید ہوا کی ضرورت ہو۔

بد قسمتی سے ہم میں سے ایک کیڈٹ ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار کھِلکھلانے لگا۔ یہ سارجنٹ کے لیے دُوسرا چیلنج تھا۔ اَب کے ذرا بلند آواز سے مجرم سے مخاطب ہوا اور

اُسی پُرانے مضمون کو نئے جامے میں پیش کیا۔

”ذرا آپ ہی بتائیں کہ آپ نے پیدائش کی زحمت کیوں گوارا کی؟“

کیڈٹ ذرا کھسیانا ہو کر نیچے دیکھنے لگا، تو سارجنٹ گرجا:

”اُوپر دیکھو، زمین کا معائنہ بھنگی صُبح سویرے کر چکا ہے۔“

کیڈٹ سارجنٹ کی یورش سے لڑکھڑایا اور اضطراب میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

اس پر سارجنٹ دُوسرے کیڈٹوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

”ذرا دیکھنا، اَب یہ حضرت براہِ راست خُدا سے آرڈر لینا چاہتے ہیں۔“

پھر کیڈٹ کی طرف مُڑ کر چلّایا۔

”میری ناک کی سیدھ میں دیکھو، خُدا بہت بُلند 'لیول' پر ہے۔“

پریڈ کے بعد اِس کیڈٹ کا وزن خاصا ہلکا ہو چُکا تھا۔

ڈرل کے بعد تمام پیریڈ پڑھائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھلائی کے تھے۔ اگرچہ لیکچروں کے کمروں تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا؛ تاہم کمروں کے

اندر دست و پا کی حرکات پر پابندی نہ تھی۔ مثلاً مکھّی یا مچھّر سے تحفّظ ہمارے بس کی بات تھی۔ اِن کی ناجائز پرواز پر ہم حسبِ ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اِتنی سی آزادی سے زندگی میں کیف باقی تھا۔

رات کو ڈِنر پر گئے تو ذکر اس موضوع پر نہ تھا کہ ہماری لفٹینی کس مرحلے پر ہے بلکہ یہ کہ ڈرل میں کبھی ناغہ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ فوجی کیڈٹ کے اس انکشاف پر کہ اتوار کو مکمّل چھٹّی ہوتی ہے، بے اختیار اِس کا مُنہ چومنے کو جی چاہا۔ جبینِ نیاز میں تشکّر کے سجدے تڑپنے لگے اور اللہ تعالیٰ کی بیکراں نعمتوں میں سے اتوار کی تعطیل کا خصوصیت سے احساس ہونے لگا۔ اتوار کا انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہو گا۔ اب ہماری تمام تر دعائیں چھٹیوں اور بارش کے لیے وقف ہو گئیں اور لفٹینی کی عنایت کے لیے ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی مزید زحمت نہ دی۔

الغرض لفٹینی کا وُہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصوّرات کے مُو قلم سے بنایا اور سجایا تھا، پہلے روز ہی مُنہدم ہو گیا اور یہ ابھی ابتدا تھی جو کچھ آگے ہوا، اس کی روداد طویل بھی ہے اور جان گسل بھی۔ مختصر یہ کہ پہلی ڈرل میں پاؤں فگار ہوئے تھے۔ چند روز میں رائفل مِلی تو سلوپ (SLOPE) کرتے کرتے ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے۔ رائفل پر سنگین کا اضافہ ہوا اور مصنوعی دُشمن کو مارنے

کی مشق کرائی جانے لگی تو تقریباً خودکُشی ہو کر رہ گئی۔ میلوں بے آب و دانہ مگر باپٹھّو[7] مارچ کیا۔ حتیٰ کہ اِن کافر بوٹوں کے دِل بھی موم ہو گئے، لیکن کسی سارجنٹ کو رِقّت نہ ہوئی۔ مُسلسل کھدائی سے ارضِ مہو کا سینہ شق ہو گیا، لیکن کمپنی کمانڈر کا دِل نہ پگھلا۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہوئے مورچوں کے ہر خط اور زاویے کا جائزہ لیا، لیکن ہمارے زخمِ جگر کی خبر نہ لی۔ نمیچ روڈ[8] کے چپّے چپّے پر ہم نے رنجور قدموں کے نقوش چھوڑے۔ ہیما پہاڑی[9] کے ہر سنگریزے پر ہم نے آبلے پھوڑے۔ ہماری ہر صُبح چوبی گھوڑے پر سے کودنے اور رسّے پر چڑھنے میں صَرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرچ اور بد ذائقہ انگریزی ڈنر کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ ایکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لیے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ دیسی کھانے کے لیے باورچی کی ہزار منّتیں کیں۔ لیکن بد بخت سارجنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہوا۔ جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی ہی کو

---

7 پٹھو ساز و سامان کا وہ وزنی تھیلہ جو مارچ کرتے وقت پشت پر اٹھایا جاتا ہے۔

8 مہو کے نواح میں ایک سڑک ہے جس پر اکثر مارچ کیا جاتا تھا۔

9 ہمیا ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے جو مہو سے چند میل دور ہے اور جہاں اکثر فوجی مشقیں کی جاتی تھیں۔

قتل کر ڈالیں، لیکن اگر اس کی ہمّت بھی ہوتی، تو فرصت کہاں تھی؟ اور آخر ایک روز فُرصت ملی، تو معلوم ہوا کہ لفٹین ہو گئے ہیں!

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دُوسرے جمعے ہی نازل نہیں ہو گئی تھی، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے ہمیں بے چاری نرگس کی طرح پُورے نو مہینے اپنی بے نُوری پر رونا پڑا۔ چنانچہ ہم ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ

بڑی مُشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نزولِ لفٹینی

ٹریننگ کا چھٹا مہینہ تھا کہ سِگنل کی تربیت کے لیے دس کیڈٹوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب اُمّیدواروں کو ایک علیٰحدہ ادارے یعنی سِگنل ٹریننگ سنٹر میں جانا تھا۔ شاید یہ ایکسٹرا ڈرل کا خوف تھا کہ ہر کیڈٹ نے او ٹی ایس سے جان چھڑانے کے لیے عرضی دے دی، کیونکہ اُڑتی سی خبر تھی کہ سِگنل ٹریننگ سنٹر میں کیڈٹ بھی اِنسانوں میں شمار ہوتا ہے اور جب ہمارا نام دس مُنتخب کیڈٹوں کی فہرست میں آ گیا تو باقی کیڈٹ ہمیں اِس طرح مُبارکباد دینے آئے جیسے جشنِ استقلال کی خوشی میں قبل از وقت رہا ہونے والوں کو پس ماندہ قیدی رُخصت کرتے ہیں۔

سِگنل ٹریننگ سنٹر بھی مہو میں تھا اور او ٹی ایس سے بہت دُور نہ تھا۔ جس روز ہم او ٹی ایس سے رخصت ہوئے ہمارے ذمّے دو چار ایکسٹرا ڈرل باقی تھیں اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں سِگنل سنٹر میں پہنچنے کے بعد بھی او ٹی ایس والے اِس اُدھار کی ادائیگی کا مطالبہ

نہ کر بیٹھیں۔ اتّفاق سے دو دن بعد او ٹی ایس کا سارجنٹ میجر سِگنل سنٹر میں آ نِکلا اور ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ ایکسٹر اڈرل کا حساب چُکانے آیا ہے، لیکن جب اس نے عام اِنسانوں کی طرح ہم سے ہاتھ ملایا اور اُسی طرح مُسکرانے بھی لگا جس طرح ہم آپ مُسکراتے ہیں تو باور نہ آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ کیڈٹ خُدا کی اسفل ترین مخلوق ہے لیکن ابھی ہمارے لیے آخری حیرت باقی تھی۔ جب پیار محبّت کی باتوں کے بعد ہم سے رخصت ہونے لگا تو ہمیں سَر کہہ کر مخاطب کیا، پھُرتی سے سلیوٹ کیا اور جانے کی باقاعدہ اِجازت مانگی۔ یہ واقعات ہمارے لیے اِس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی ہمارے گلے میں ہار ڈال کر ہمیں خاوند منتخب کر لیتی تو ہمیں بالکل تعجب نہ ہوتا اور ہم بلا تکلّف ولی عہدی شروع کر دیتے۔

سِگنل سنٹر میں پہنچے تو وُہ جو احترامِ انسانیت کی افواہیں تھیں، سَچ مُچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام اُستاد اَدب سے پیش آئے، لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابلِ اَدب قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ساری تعظیم ہی ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام سقّے کی اپنی مختصر سی جلالت مآبی کے دَور میں ہوئی ہو گی۔ شاید ہماری حالت زار نظام سے بھی کچھ پتلی تھی، کیونکہ اسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ فالتو احترام واقعی کوئی دیرپا چیز ہے یا کسی وقت یہی مؤدب انسٹرکٹر ایک ہلا کو انہ قہقہہ لگا کر ہمیں ثریا سے کھینچ

کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہوں گے اور ایکسٹرا اڈرل! لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اِس احترام میں ملاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مرتبے کا احساس قصداً دلایا جا رہا تھا۔ وہی احساس جو او ٹی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اُس وقت کہ ہم تازہ تازہ شہری زندگی سے فوج میں آئے تھے، وہی صحیح تھا اور اَب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جا رہے تھے۔

لیکن ہم اپنے اُستادوں کی نسبت اپنے انگریز ہم جماعتوں سے وُہ کچھ سیکھ رہے تھے جو زندگی بھر نہ سیکھا تھا۔ جماعت میں ہم بیس کیڈٹ تھے، دس دیسی اور دس انگریز۔ یہ انگریز ہندوستان میں انگریزی فرموں کے مُلازم تھے اور جبری بھرتی کے قانون کے تحت تربیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یوں تو ہم سب برابر تھے، لیکن جماعت میں اِن انگریز طلباء کا کاروبار ہم دیسیوں سے بہت مختلف تھا۔ وُہ جماعت میں اُستادوں کے ساتھ یوں ہم کلام ہوتے جیسے چائے پیتے ہوئے دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں۔ اَدب ضرور کرتے لیکن خوف نہ کھاتے۔ ان سے کوئی انسٹرکٹر سوال پُوچھتا تو جواب دینے سے پہلے آرام سے پائپ کا کش لگاتے، پھر اُسے ڈیسک پر رکھتے اور پھر کرسی پر ذرا نیم دراز ہو کر جواب دیتے اور اس انداز سے کہ اگر درست ہے تو خیر، اگر نہیں بھی تو کوئی حرج نہیں کہ یہی ہمارا نقطۂ نگاہ ہے۔

برخلاف اس کے ہم دیسیوں کے دِل میں ہر وقت چور سا رہتا۔ جواب آیا تو جواب

دینے میں بیتابی۔ اگر نہ آتا تو احساسِ جرم اور چھپنے کی کوششیں۔ اُن لوگوں کی خود اعتمادی اور پختگی اُن کے کردار کا حصّہ تھی اور یہ غالباً اُن کی ابتدائی تعلیم کا فیض تھا۔ ہمارا احساسِ کمتری ہماری اپنی ابتدائی تعلیم کا عطیہ تھا۔ وہی تعلیم جس میں شاگردوں کو مُرغا بنانا اُستاد کی بہترین TEACHING AID یعنی درسی امداد ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے لیے نئی چیزیں سیکھنا اِتنا ضروری نہ تھا جتنا پُرانی عادتیں بھُلا دینا۔ اور ہم میں سے وُہ جو ایسا نہ کر سکے، سینئر عُہدوں پر پہنچ کر بھی نابالغ ہی رہے۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں نالائق یا نکمّے نہیں ہوتے۔ کئی ایک کا ذکر آگے آئے گا بھی۔ نکتہ یہ ہے کہ صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں، کچھ شخصیت ہونا چاہیے، کچھ کردار ہونا چاہیے اور وُہ جو اقبال نے کہا ہے کہ کچھ محفل میں بات کرنے کا شعور ہونا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ اِن معاملات میں ہم اِن انگریز دوستوں کو بتائے بغیر اُن کی شاگردی کر رہے تھے اور مُرغا بنے بغیر وُہ کچھ سیکھ رہے تھے جو مکتب کی خاک بازی میں نہ سیکھ پائے تھے۔

ذکر سِگنل سنٹر کی زندگی کا تھا۔ اس زندگی میں آسائش تھی لیکن خُدا جانے کیا وجہ تھی کہ وُہ لُطف نہ آرہا تھا جو درشتی اور مشقّت کے باوجود او ٹی ایس کی زندگی میں تھا۔ جب اِس مسئلے کو اندر سے جھانک کر دیکھا تو ہم پر روشن ہوا کہ درشتی اور مشقّت ہی تو لُطف کا منبع تھے

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لیکن سِگنل سنٹر کی زندگی فقد اللہ ہو کے گرد ہی نہیں گھُومتی تھی۔ جہاں ارجن سِنگھ ایسے ہم جماعت ہوں وہاں کئی ایسے واقعات ناگزیر تھے جو دِل یزداں میں بھی کھٹکتے لگیں۔ اَرجن سنگھ ایک قوی ہیکل اور خوش مزاج سِکھ کیڈٹ تھا۔ پینا اُس کی کمزوری تھی۔ ایک شام ارجن سنگھ کو معمول سے زیادہ بدمَست پایا گیا۔ حالانکہ اُس روز میس میں اَرجن سنگھ نے شراب کو چھُوا تک نہ تھا۔ دُوسرے روز کلاس میں بھی اَرجن سنگھ معمول سے زیادہ موج میں تھا اور کلاس کے رستے میں کوئی میخانہ بھی نہ پڑتا تھا۔ ہمارے ایک انگریز ساتھی مارٹن نے شرارتاً کہہ دیا کہ اَرجن سنگھ نمبو پانی پر ہی ٹائٹ ہو گیا ہے۔ اَرجن سنگھ اس تُہمت پر بزرگانہ انداز میں مُسکرا دیا۔ شام ہوئی تو اَرجن سنگھ کی مستی عروج پر تھی۔ دفعتاً اپنے کمرے سے نِکلا اور ایک دُوسرے کیڈٹ کی کمر میں بازو ڈال کر ناچنے لگا۔ معمّا یہ تھا کہ اَرجن سنگھ آخری پی کیا رہا ہے جو دو روز سے ہوش ہی نہیں آتا؟ رقص جاری تھا کہ ہمارے کمان افسر یعنی کرنل صاحب اِدھر آنِکلے۔ دراصل وُہ بھی اَرجن سنگھ کی مستی کا عقدہ حل کرنے کی فِکر میں تھے۔ اَرجن سنگھ نے اُنہیں دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بڑھا اور کرنل صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کی ابتدا کرنے لگا، لیکن کرنل صاحب نے مُسکرا کر کہا:

”ارجن سنگھ، ناچیں گے بعد میں، آؤ ذرا تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“

ارجن سنگھ بخوشی راضی ہو گیا۔ بدستور کرنل صاحب کی کمر میں بازو ڈالے انہیں کمرے میں لے گیا اور حسبِ دستور پُوچھا کہ کچھ پیئیں گے؟ کرنل صاحب یہی تو معلوم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں کا وُہ روایتی فقرہ بولے ”I would love it“۔ اِس پر ارجن سنگھ اُٹھا، اپنا پلنگ اُلٹایا۔ نیچے دو کنستر دیسی شراب کے پڑے تھے۔ ارجن سنگھ نے ایک پر سے ڈھکنا اُٹھایا اور ایک لمبا گلاس لبالب بھر کر کرنل صاحب کو پیش کیا۔ کرنل صاحب ذرا جھجکے، تو ارجن سنگھ بولا:

”چھک جاؤ موتیاں والیو۔ آہ وِسکی اے۔ آپاں گھر بناونے ہاں۔“

کرنل صاحب کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا البتہ انہوں نے ارجن سنگھ کی خوشنودی کے لیے گلاس مُنہ سے لگا لیا۔ خدا جانے ارجن سنگھ کی خانہ ساز میں کیا تاثیر تھی کہ کرنل صاحب ایک دفعہ گلاس کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد جدا نہ کر سکے اور پورا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔ راوی یعنی ارجن سنگھ کے بیرے کا کہنا ہے کہ کرنل صاحب نے دُوسرا گلاس اپنے ہاتھوں سے بھرا اور چڑھا گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ بعد جو نظارہ ہم باہر کھڑے ہوئے تماشائیوں نے دیکھا، یہ تھا: کیڈٹ ارجن سنگھ اور کرنل صاحب اپنے ہاتھوں میں جامِ شراب تھامے اور بازو ایک دُوسرے کے گلے میں حمائل کیے تھرکتے تھرکتے

کمرے سے باہر آتے ہیں اور ہم سے قطع نظر کیے ہوئے چل نکلتے ہیں۔ اگر کسی سے ذرا آنکھ لڑ جاتی ہے، تو نہایت چابکدستی سے جوابی آنکھ مارتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اَرجن سنگھ کا بیرا سر پر کنستر اُٹھائے ان کے پیچھے پیچھے رواں ہے۔ بیرے سے پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کنستر کی منزل کرنل صاحب کا بنگلہ ہے۔

یہ سِگنل سنٹر کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ کام کی بھی کمی نہ تھی، تاہم ظاہر تھا کہ اِس ماحول میں وُہ او ٹی ایس کے دنوں کے خودکشی کے منصوبے قطعاً بے جا ہیں، بلکہ یہاں کچھ اِس تیزی سے دِن کٹے کہ ایک دن لفٹینی کا حکم آ گیا اور آناً فاناً ہمارے شانے پھُولوں سے جگمگا اُٹھے۔ اگرچہ ان کی تعداد بالفعل ایک پھُول فی شانہ ہی تھی۔

اَب ہمیں آنے والی زندگی سے عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا۔ کورس کے خاتمے سے چند روز پیشتر پوسٹنگ کے سلسلے میں ہم سے اپنے مرغوب اسٹیشن پوچھے گئے۔ ہمارا انتخاب بالترتیب لاہور اور پشاور تھا۔ لاہور آنے کا ہمیں خاص شوق تھا کہ جس دیار کے کوچوں کی ہم نے ایک گمنام طالبِ علم کی حیثیت سے خاک چھانی تھی، اَب اُسی خاک کو افسرانہ شان سے روندنا چاہتے تھے۔ جب پوسٹنگ کا حکم شائع ہوا تو ہمارا تقرّر پشاور ڈسٹرکٹ سِگنلز میں ہوا۔ لاہور نہ مِلنے پر مایوسی تو ہوئی، لیکن قابلِ برداشت سی۔ پشاور کی ایک خُوبی تو ظاہر تھی کہ ہمارے لیے نئی جگہ تھی۔ علاوہ ازیں جب اپنے پٹھان دوستوں سے پشاور چھاؤنی کی دلچسپیوں اور پشاور کلب کی رنگینیوں کے چرچے سُنے، تو نہایت بے تابی

سے رختِ سفر باندھا۔

نیم لفٹین پشاور میں

اپریل ۱۹۴۱ء کی وُہ صُبح بھُولنے کی نہیں، جب وُہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفٹینوں کی ہنستی گاتی ٹولی کو لیے مہو کے اسٹیشن سے نکلی۔ معاً ہمیں وُہ دِن یاد آیا جب نو ماہ پیشتر ہم اسی اسٹیشن پر پہلی مرتبہ اُترے تھے اور گورے سارجنٹوں نے ہمارے پندار کی گُربہ کاروزِ اوّل ہی کام تمام کر دیا تھا، لیکن وہی گورے آج ہمیں سلیوٹوں سے رُخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال[۱۰] اِس بلندی پر کبھی نہ پہنچا تھا۔ اَب ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ۔ دُنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی۔ حتّٰی کہ مہو کے وُہ مضافات بھی چلتی گاڑی سے دلفریب نظر

[۱۰] Morale: حوصلے اور خود اعتمادی کے لئے فوج کا سکہ بند لفظ۔

آ رہے تھے جن سے چند مُہلک قسم کی فوجی مشقوں کی یاد وابستہ تھی۔ ہیما پہاڑی تو ہمیں وادیٔ گنگا کی طرح محبّت کے اِشارے کر رہی تھی۔

دازیٔ سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کے لیے جو منصوبے بنائے وُہ زیادہ تَر میس، کلب، برِج، سواری اور یونیفارم وغیرہ کے متعلّق تھے۔ یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ عین اُس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچی تھی؛ تاہم ہمارے ہزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سَر دھڑ کی بازی بھی لگا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں بھی کچھ اِسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا، لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جارہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے جا تھا؛ البتّہ ہمارے ایک پشاوری ساتھی محاذِ جنگ پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسردہ تھے بلکہ ٹریننگ کے دِنوں میں ہی جب ایک دن کسی مضمون میں فیل ہونے پر اُن سے باز پُرس ہوئی، تو اُنہوں نے کھُلے لفظوں میں کہہ دیا تھا:

"ہم فیل میل کچھ نہیں جانتا۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے۔ ہم کو لڑائی میں بھیجو، ہم بادشاہ کی خِدمت کرنے آیا ہے۔"

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ اِن کے گھر میں ایک ڈھال اور ایک تلوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ اُن کی خاندان کی روایات کے مطابق بانیٔ خاندان کے

استعمال میں آیا تھا۔ اگرچہ اِس بات کا تعین نہیں ہو سکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے ظہور میں آیا تھا یا بعد میں لیکن بہر حال یہ اِس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آبائی سپہ گری کے اس تابناک پس منظر میں آپ کو یہ کسی صورت گوارانہ تھا کہ حُسنِ اتفاق سے جنگ جاری ہو (یعنی خُدا نے ان کے لیے دادِ شجاعت دینے کے تمام اسباب پیدا کر رکھے ہوں) اور وُہ راولپنڈی جیسے دارالامان کو بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خُون کھولتا رہا اور ہم سے الگ غصے میں WARLIKE STORE بنے بیٹھے رہے۔

مہو سے پشاور تک سب ساتھی درمیانی اسٹیشنوں پر اُتر گئے اور گاڑی سرِ شام پشاور پہنچی۔ ہمارے استقبال کے لیے دو افسر موجود تھے۔ دونوں انگریز۔ اُن دِنوں دیسی افسر ابھی گنتی کے تھے۔۔۔ دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان نے جنگ میں کود کر آگ سی لگا دی اور وہی لفٹینی جو ہم نے خونِ جگر سے حاصل کی تھی، سرِ راہ بٹنے لگی۔۔۔ اَب اِستقبال کو تو یہ دو انگریز آ گئے تھے، لیکن اُن کا طرزِ تپاک کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر دِل جل تو نہ گیا، لیکن جھُلس ضُرور گیا۔ پھیکی سی مزاج پُرسی اور بس۔۔۔ پھر کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گپّیں ہانکنے لگے۔ گویا پچھلی سیٹ پر اِنسان نہیں بستر رکھّا ہے۔

سِگنل آفیسر ز میس میں پہنچے، تو ہمیں اپنا کوارٹر دکھایا گیا۔ ایک اُمّیدوار بیرا شیر باز پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شاملِ خدمت ہو جائے۔ ایسا ہی ہوا، وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لیے کپڑے بدلے۔ چونکہ میس میں جانے کے لیے پہلی شب کا معاملہ تھا۔ اپنی ''ٹرن آوٹ'' کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اِس سلسلہ میں شیر باز کے ماہرانہ مشوروں سے استفادہ کیا کہ وُہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیراتوپ [11] کے طفیل اِن معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔

میس میں پہنچے، تو معلوم ہوا کہ بیتابی میں سب سے پہلے آ گئے ہیں۔ انٹی روم کے زیبائشی سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سِگنل افسر کو کہیں، ریڈیو نظر آ جائے، تو بقول شخصے اُسے چھیڑنے کا ''پنگا [12]'' ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ سُوئی اتفاقاً لاہور کے اسٹیشن پر جا رُکی جہاں سے کوئی غیرتِ ناہید ڈھولک کا گیت گا رہی تھی ''ٹاہلی دے تھلے بہہ کے۔'' ہم اِس کے شعلے کی

---

۱۱ یہ لفظ بیرا کا پشتو حاصل مصدر ہے۔

۱۲ پنجابی لفظ ہے۔ مطلب ہے خواہ مخواہ وہ کام کرنا جو نقصان کا باعث ہو۔

لپک میں آ گئے اور میس ومافیہا سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر سُننے لگے تا آنکہ باہر سے بیک وقت دو چار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اِس گُستاخ کے نام اور سَر کا مطالبہ کیا جو یہ وحشیانہ موسیقی سُننے کا ارتکاب کر رہا تھا۔

یہ چند انگریز افسر تھے جو ابھی میس کے بیرونی دروازے تک ہی پہنچے تھے اور اس انگریز کدے میں دیسی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے۔ وُہ ابھی باہر ہی شور مچا رہے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ یونٹ میں پہلا دن ہے۔ اپنے متعلق اوّلین تاثرات خراب کرنا قرینِ مصلحت نہیں، لہٰذا ریڈیو بند کر دینا چاہیے، لیکن کسی اندرونی آواز نے مشورہ دیا کہ ریڈیو بند کر کے تُم اِن کی خوشنودی تو شاید حاصِل کر سکو گے یا نہیں البتّہ اپنی بُزدلی کا خاصا پُختہ ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہنے دیا، لیکن اَب سحرِ موسیقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ تحفّظِ ناموس کی خاطر۔

انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے میس خالی دیکھ کر گانا لگا رکھّا ہے لیکن جب اندر داخل ہوئے اور مُجھے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ سَچ مُچ غدر کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ذرا رُکے اور پھر اِن میں جو ایمپائر کا سب سے بڑا فدائی تھا، بڑھا اور مُجھ سے کہنے لگا۔ ”خبریں نہ سنو گے ؟“ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سُوئی گھُما کر بی بی سی پر کر

دی۔ اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع تھیں؛ چنانچہ میں خاموش رہا۔

مَیں اِس میس میں نووارد تھا لیکن کسی نے مجھ سے مصافحہ تک نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ نادانستہ سہی، لیکن قصور ہم نے معرکے کا کیا ہے، جسے انگریز کی آئندہ نسلیں بھی معاف نہ کریں گی۔ بعد میں دُوسرے افسر آئے۔ وُہ بھی انگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا عِلم نہ تھا۔ اِن میں سے ایک جو اسٹیشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوڈنٹ تھا، ہمارے صوفے پر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ مَیں نے میس اور اُس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے پوچھا:

"یہ عورت کون ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوڈنٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مُجھے ایک حیرت، ایک قہر کے عالم میں گھُورتے ہوئے بولے:

"عورت؟ خُدا کے بندے یہ محض عورت نہیں، پرنسس رائل ہے! تمہاری سِگنل کور کی کرنل کمانڈانٹ! تم واقعی سِگنل ہو؟"

اَب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شہزادی موصوف کے کرنل کمانڈانٹ ہونے کا عِلم اور فخر ضرور تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر اُن ہی کی ہے اِس کا مُجھے عِلم نہ تھا۔ ایسے حالات

میں انگریزوں میں معذرت کا ایک معروف فقرہ دُہرایا جاتا ہے اور سارا گلہ دُھل جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی عمل کیا، لیکن گلہ دُھلنا تو کجا، اِس انگریز کے چہرے پر سیم اور تھور کی نوع کی علامات پیدا ہونے لگیں اور اِن کے آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ناچار چُپ ہو کر بیٹھ گیا۔

ہمارے لیے یونٹ کی ابتدا یقیناً اچھّی نہیں ہوئی تھی، لیکن اَب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ دِل کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اِس مُلک میں جب تک ہمارا واسطہ انگریزی اُونٹ سے ہے، کوہان تو ہو گا۔ باقی رہیں میس کی پہلی رات کی وارداتیں، تو اِن سے پریشان ہوا لفٹین کی شان نہیں۔ میس کے باہر بھی بیسیوں کام ہیں ان میں قابلیت کا سِکّہ بٹھایا جا سکتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دِل جڑ بھی سکتے ہیں۔ ویسے اس شب کھانے کے دوران اُن کے جڑنے کا کوئی اِمکان نظر نہ آیا، بلکہ ایک پلیٹ ہمارے ہاتھ سے ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریڈیو، تصویروں، پلیٹوں غرض ہر چیز نے ہمارے خلاف سازش کر رکھّی ہے۔ فقط ایک شخص جو بائیں جانب میز پر بیٹھا تھا، ہم سے کسی قدر گرمجوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وُہ ولایت سے تازہ تازہ آیا تھا اور ایک دیسی کا انگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ لیفٹیننٹ وائٹ تھا۔ جان وائٹ کی مُلاقات اُس شب کے ناگوار حادثوں کے بعد مُنہ میں گویا میٹھا ذائقہ چھوڑ گئی۔

دُوسرے دن کمان افسر سے مُلاقات ہوئی۔ خیال تھا رات کی لغزشوں کی صفائی طلب

کریں گے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ایڈ جوڈنٹ صاحب نے البتّہ اعلانِ جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ دانت پیس پیس کر ہمیں نئے فرائض کے متعلق حکم سُنایا اور نتیجتہً ہم ایک ایسے سیشن کے افسر یا فوجی زبان میں او سی (O.C) مقرّر ہوئے جس کا کام پہاڑی توپ خانے کو مواصلات بہم پہنچایا تھا۔

اِس سیکشن میں اِنسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچّر زیادہ۔ طبیعت پہلے تو کچھ برہم ہوئی، لیکن جب مَیں اپنے سیکشن میں پہنچا اور اِن لوگوں سے مُلاقات ہوئی تو ایمان تازہ ہوگیا۔ یہ سیکشن تمام تر پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ سُن کر ایک دیسی افسر پہلی مرتبہ او سی مقرّر ہوا ہے، ان لوگوں نے اِس خلوص سے میرا خیر مقدم کیا کہ مَیں انگریزوں کی رنجش بھُول گیا۔ سینئر عہدیداروں نے نہایت شوق سے مجھے سیکشن کا سامان دکھایا اور جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچّروں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں! ان سب کے اپنے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج تھے، اور اپنی اپنی شخصیتیں! اِس پہلی ملاقات پر سیکشن کے لوگ جس محبّت کا اظہار کر رہے تھے، وُہ خود اِس سے کہیں زیادہ محبّت کیے جانے کے قابل تھے اور میرے دِل میں یہ عہد مستحکم ہو رہا تھا کہ اِن لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اُس شام جب میں میس میں گیا تو انگریز اگرچہ بدستور کھِچے کھِچے سے تھے، لیکن میرے دِل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے انگریزوں کی ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارا

مقاطعہ ایسا مکمّل بھی نہ تھا۔ جان وائٹ ہم سے غیر معمولی تپاک سے بغلگیر ہوئے۔ اور ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے بولے: ”ذرا اپنے مُلک کا گانا تو سُناؤ۔“ پھر ہنس کر بتایا کہ آج دِن بھر تمھارے پنجابی گانا سُننے اور پرنسس رائل کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلّق بحث ہوتی رہی۔ سارجنٹ لوگوں نے تو تمھارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچا دی، لیکن اُلٹی اُن کو تنبیہہ ہوئی۔ مَیں نے پوچھا: ”سارجنٹ لوگ کون؟“ تو کہنے لگا: ”یہی تُم سے لڑنے والے افسر۔ یہ سب پہلے سارجنٹ تھے اور اگر لڑائی نہ چھڑتی تو اس وقت بھی سارجنٹ ہی ہوتے۔“ بہر کیف ہم نے کسی قدر فاتحانہ انداز سے اِن لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتقامی جذبے پر قابُو پا کر ریڈیو کو تو نہ چھیڑا، لیکن جان وائٹ کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر مُنہ سے ماہیے کی ایک کلی گُنگُنا دی اور جان نے اپنی تحسین کے اظہار کے لیے والہانہ تالی بجا دی۔

وائٹ سے اب ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ دُوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ بیر نہ تھا۔ البتہ وہ ذرا خفا سے تھے اور وائٹ کی حرکتیں اِس خفگی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔ وائٹ دراصل ایک اچھّے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔ اُسے اپنے تلفّظ کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریز افسروں سے نہایت اہتمام سے نفرت کا اظہار کرتا تھا کیونکہ اُن کی زبان اور تلفّظ گرامر کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ اِن کے پاس فقط دس بارہ فحش مگر چُست اور

جامع سے الفاظ تھے جن سے وُہ اپنا تمام تر مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کی ڈکشنری میں نہیں ہوتے، یہ صرف سارجنٹ لوگوں کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ وائٹ کی اپنی زبان بیشک کلچر کی آئینہ دار تھی، لیکن جو چٹخارا سارجنٹوں کی مرصّع زبان میں تھا، اُس سے بھی اِنکار مُشکل ہے۔

یونٹ میں کوئی پندرہ دِن گُزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا تبادلہ ہو گیا۔ اُن کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈجوڈنٹ نے طلب کیا اور حکم دیا:

"آج تم اٹھارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے بنّوں جاؤ گے اور وہاں سے آگے ٹوچی کالم میں جا کر شامل ہو گئے جو اس وقت فقیر ایپی کے خلاف وزیرستان میں دتّا خیل کے مقام پر مصروفِ جنگ ہے۔ وہاں تُم لیفٹیننٹ ٹام کو فارغ کرو گے۔"

جب وائٹ کو ہمارے تبادلے کا عِلم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

"یہ ٹام بھی سارجنٹ ہے۔ اِس کے نہ ہونے سے اِن لوگوں کی بِرج کی چوکڑی نامکمّل تھی۔ صِرف کمان افسر کے کہنے پر تمہیں یہاں رکھّا گیا تھا ورنہ پہلے ہی دن فقیر ایپی کی خِدمت میں بھیج دیے جاتے۔"

اٹھارہ سو بجے ہم بنّوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فرنٹیئر کی لڑائیوں میں بیر اساتھ

لے جانے کی اجازت ہوتی ہے؛ چنانچہ شیر باز ہمارے ساتھ تھا۔ وُہ اس سے پہلے بھی اپنے کئی انگریز صاحبوں کے ساتھ سرحدی معرکوں میں شریک ہو چکا تھا۔ عام لوگوں کو عِلم نہیں کہ اِن سرحدی لڑائیوں میں بھی دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیر باز سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اُس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دو کان واپس مِلے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لیے شیر باز نے اپنا اضافہ کیا کہ "تم فِکر مت کرو، وُہ مُسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے۔"

اِدھر سیٹی بجی اور گاڑی بنّوں کو روانہ ہوئی۔

کوہستانِ جنگ

بیرے شیر باز نے ہمیں انگریزوں کے مقابلے میں رعایت تو کافی دی تھی کہ مرنے کے بعد ہمارے کانوں کی بے حُرمتی نہیں کی جائے گی، لیکن قبائلیوں کی اِس اسلامی رواداری کے باوجود ہمیں زندہ رہنا کچھ زیادہ بہتر ہی معلوم ہوتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایک انگریز کو بِرج کے لیے فارغ کرنے کو بھیجا جا رہا تھا۔ کوئی شہادت کا معاملہ تو تھا نہیں کہ ہم گاڑی میں داخل ہوتے ہی سَر بکف ہو جاتے؛ چنانچہ بالکل عام آدمیوں کی طرح سفر کیا۔ عام آدمیوں کی طرح بھیجنے والوں کو کوسا اور رات کو وہی متوقع خواب دیکھے کہ کان غاب ہیں۔

دُوسرے روز بنّوں ٹرانزٹ کیمپ میں پہنچے۔ منزلِ مقصود تو میر اں شاہ سے آگے دتّا خیل تھی جہاں ہمارا بریگیڈ (ٹوچی کالم) فقیر اپی سے لڑنے کے لیے بڑھ رہا تھا، لیکن بنّوں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آگے جانے کے لئے (R.O.D) یعنی سڑک کھُلنے کے دِن کا

انتظار کرنا پڑے گا جو ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ آتا تھا۔ اِس وقفے میں شیر باز کو اتفاقاً علم ہو گیا کہ ہمیں چالاکی سے ٹام کی جگہ بھیجا جا رہا ہے۔ شیر باز اِس پر بہت برہم ہوا۔ مجھے تو پشتو نہیں آتی تھی، لیکن ٹام کے حق میں جو خاردار سی پشتو اُس کے مُنہ سے نِکلی، ظاہر تھا کہ قصیدے کی قسِم کی چیز نہیں؛ البتہ اُردُو میں شیر باز نے ہمیں اِتنا کہا کہ "صاحب آپ کے ساتھ ٹگی (ٹھگی) ہو گیا ہے، ہم اِس کا علاج کرے گا اور تم کو واپس پخاور بیجے گا۔" (پشاور بھیجے گا)

یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیر باز فوجی احکام میں ترمیم کیسے کرائے گا، لیکن شام کے کھانے کے لیے میس کو جانے لگا، تو شیر باز ایک تکّے کبابوں سے لبریز پلیٹ لے کر آ نِکلا۔ کسی انگریزی میس کے رَستے میں ایک دیسی افسر کے لیے تکّے کبابوں سے بہتر کوئی روڈ بلاک نہیں؛ چنانچہ اس رات ہم میس سے غیر حاضر رہے۔ اس کے بعد شیر باز نے ہر کھانے سے پہلے تکّے کباب کھلانے کا معمول بنا لیا۔ اِسی طرح ہفتہ گزر گیا اور سڑک کھلنے کا دن آ گیا۔ صُبح کانوائے جانا تھا۔ رات شیر باز آیا، تو میں نے کہا:

"شیر باز، وہ پخاور کی واپسی کیا ہوئی؟"

شیر باز کسی قدر جھنجھلا کر بولا۔

"ہم نے تم کو اِتنا تِکّا کباب کلایا (کھلایا) خوہ تم ناجوڑ ہی نہیں ہوتا۔"

شیر باز کی سکیم کا اندازہ مجھے پہلا ٹِکّا کھا کر ہی ہو گیا تھا؛ چنانچہ مَیں نے اُسی حَد تک زبان درازی کی تھی جو باعثِ فساد نہ ہو۔

اگلے روز علی الصبح ہمارا کانوائے روانہ ہوا اور ہم پر پہلی مرتبہ آر او ڈی کے اسرار فاش ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ اُن دِنوں قبائلی علاقے میں سفر کرنے سے پہلے چند اعتراضات رفع کرنا پڑتے تھے۔ بد قسمتی سے یہ لوگ اپنے اعتراضات کے اظہار میں زبانی فصاحت یا بلاغت کے قائل نہ تھے، بلکہ سِرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً آپ موٹر میں جا رہے ہیں اور اچانک کہیں سے ایک گولی آپ کے ٹائر میں بطور اعتراض آ لگتی ہے۔ یا چلتے چلتے اپنے رستے میں پُل غائب پاتے ہیں اور دو چار ذرا خونخوار قسم کے معترضین آپ کے استقبال کے لیے آوارد ہوتے ہیں جو بِلا تکلّف آپ کو موٹر سے نکال کر آپ کا روپے پیسے اور کپڑوں کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ آپ میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر لیتے ہیں اور اس کے لیے آپ سے کلمہ پڑھوانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر اگر آپ ہندو ہیں تو فی الفور آپ کی مُکتی اور نِروان کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اگر مُسلمان ہیں تو آپ کو صَوم و صلوٰۃ کی مسلسل آسانی بہم پہنچانے کے لیے ایک غار مہیا کیا جاتا ہے جہاں صَوم کا ثواب تو زیادہ تر میزبان ہی کو پہنچتا ہے؛ البتّہ صلوٰۃ کا اجر آپ کی اپنی چیز ہے۔ اِس خیال سے کہ آپ کی عبادت میں خلل واقع نہ ہو، آپ کو شِکم پُری سے خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے تا آنکہ آپ کے رشتہ دار یا

حکومت آپ کو روپوں میں تول کر واپس لے جاتی ہے یا پھر وُہی گوش تراشی کی نوبت آتی ہے۔

آر او ڈی ایسے اعتراضات کا جواب تھا۔ جس روز قبائلی علاقے کی سڑکوں سے کسی رسد کے کانوائے یا فوج کے کالم کو گُزرنا ہوتا تھا، سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوج چوکیاں جمالیتی تھی تاکہ سڑک پر آمد ورفت بغیر اعتراض جاری رہے۔ محافظ دستوں کے لیے چوکیوں پر بیٹھنا کوئی پکنک کی قِسم کی چیز نہ تھی کیونکہ دُوسروں کی نسبت یہ لوگ معترضین کی گولیوں اور خنجروں سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ سڑک پر سے گُزرنے والے اگرچہ محفوظ ہوتے تھے؛ تاہم اُن کے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بھی اِکادُکا گولی کہیں سے آ ہی نکلتی ہے۔

ہمارا کانوائے روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف حفاظتی دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ اِن میں سے اکثر سکاؤٹ اور ملیشیا کے لوگ تھے جن کے انگریز افسروں نے مزری کی شلواریں پہن رکھی تھیں اور سَر پر کلّہ دار پگڑیاں تھیں، کیونکہ اِس علاقے میں کسی سَر کا انگریزی ہیٹ کے نیچے سلامت رہنا کسی قدر غیر یقینی تھا۔

میران شاہ، جہاں ہمارا بریگیڈ فروکش تھا، پہنچے تو ٹام پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُونچا، پتلا، لال اور لمبی مُونچھوں والا۔ بالکل ٹام! لیکن نہایت خوش مزاج۔ مُجھے

دیکھتے ہی بولا:

"تو اِن بدمعاشوں نے تمھیں برِج کی خاطر نکال مارا ہے۔ تُمہارا اپنا قصُور ہے۔ تمھیں برِج آنا چاہیے تھی۔"

ٹام کی صاف گوئی مُجھے بہت پسند آئی۔ تواضع کے بعد اس نے حسبِ معمول اپنے سیکشن کے جوانوں، گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ مُجھے یاد ہے کہ ایک سُرنگ گھوڑے کے متعلّق ٹام کے تعارفی الفاظ خاصے لرزہ خیز سے تھے اور مُجھے اس سے ذرا دُور سے ہی مزاج پرسی کی ہدایت کی گئی۔ اس گھوڑے کا رجمنٹل نمبر ۲۲ تھا۔

ٹام دُوسرے روز سیکشن ہمارے حوالے کر کے پشاور چل دیا اور ہم اپنے بریگیڈ کے ساتھ دتا خیل کو روانہ ہوئے۔ دتا خیل افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور فقیر اپی کی جائے سکونت یعنی گرویخت سے قریب ترین برطانوی پوسٹ تھی۔ فقیر اپی کا قُرب حاصل کرنے کے لیے ہمیں پُل صراط کی قسم کے مقامات سے گزرنا پڑا۔ ہرچند کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوجیں پہرہ دے رہی تھیں تاہم سڑک کے بعض حصّے ایسے قبائلی نشانہ بازوں کی زَد میں تھے جو خود تو چٹانوں کی اوٹ میں ہماری گولیوں سے محفوظ تھے، لیکن اُن کی گولیوں اور ہمارے سَروں کے درمیان ہوا کے سِوا کچھ نہ تھا۔ اِس کا جواب ہمارے پاس ایک ہی تھا کہ کلمہ شریف پڑھیں۔ سڑک کا وُہ حصّہ

نہایت تیزی سے عبور کریں اور باقی معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔ اس ٹکڑے کو عبور کرتے ہوئے ہم نے اچھّے خاصے سنجیدہ بزرگوں میں سنجیدگی کی تمام علامتیں غائب ہوتے دیکھیں۔

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال

مقامِ شوق میں کھویا گیا وُہ فرزانہ

البتّہ وُہ ٹکڑا عبور کرنے کے بعد ان میں تمام تر بزرگانہ تمکنت عود کر آئی۔

ہم سے پہلے گزرنے والوں میں سے ایک دو آدمیوں کو گولی لگی، پھر ہمارے سیکشن کی باری آئی جو پچیس تیس آدمیوں اور اِتنے ہی جانوروں پر مشتمل تھا۔ اِس ٹکڑے پر قدم رکھنے سے پہلے نائک حیات مُحمّد نے دُعا مانگی کہ "اللہ ہم سب کو بچا اور ہم سے قُربانی لینا ہی ہے تو ہم گھوڑا نمبر ۲۲ پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ اِس کا علاج کچھ تیری ذات ہی کر سکتی ہے۔" معلوم ہوتا ہے نائیک حیات مُحمّد کی دُعا اللہ تعالیٰ تک خطِ مُستقیم میں جا پہنچی، کیونکہ چند منٹ بعد تمام سیکشن بخیر و عافیت پار تھا، سوائے گھوڑا نمبر ۲۲ کے جس نے سینے پر گولی کھا کر اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر دی اور اپنے این سی او (NCO) کی لاج رکھ کر فوجی ضبط کی مثال قائم کر دی۔

دتّا خیل کی پوسٹ (چھوٹا قلعہ) ایک خاصے کھُلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ ہمارے بریگیڈ نے پوسٹ کے قریب ایک وسیع دائرے میں ڈیرے ڈالے۔ دائرے کی مختلف قوسوں میں ایک معروف قاعدے کے مطابق مختلف یونٹوں کو جگہ دی گئی اور دائرے کے ارد گرد جو پستہ قد سی حفاظتی دیوار تھی اِس کی مرمّت کی گئی۔ اَب اگلے روز فقیر اپی کے خلاف جنگ آزما ہونا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب چار و ناچار ایک دو روز میں جاں بحق ہو جائیں گے۔

سرحدی جنگوں کا انداز کچھ نِرالا سا ہوتا ہے۔ ہر روز ایک معرکہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی لشکر کے جمع ہونے کی خبر سُنتے، تو اُس کی گوشمالی کے لیے جاتے۔ کبھی دُشمن کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر اُس کے مکان اور بُرج تباہ کرتے۔ کبھی سڑک بنانے کے لیے جاتے اور کبھی آر۔او-ڈی کے لیے۔

پہلے دن ایک لشکر کی تباہی کے لیے مُنہ اندھیرے ہمارا کالم کیمپ سے نِکلا۔ پلٹن، رسالہ، توپ خانہ سب کے سب خاموش؛ خوف کا سا عالم۔ جاں بحق ہونے کا شدید احساس؛ آخر میدانِ کارزار میں پہنچے تو اپنے آپ کو چند دُوسرے افسروں کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پایا۔ ہم سے ذرا نیچے ہماری پلٹن اور توپ خانے نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ اس سے نیچے نالہ تھا اور نالے سے پار کی پہاڑی پر دُشمن تھا۔ فضا بدستور خاموش تھی۔ ہم اپنی دُور بینوں سے دُشمن کی حرکات دیکھنے کی کوشِش کر رہے تھے،

لیکن ایک تِنکا نہ ہلتا تھا۔ دفعتاً سکوت ٹوٹا اور آواز آئی:

"ٹھک ٹھُوں۔"

یہ گویا قبائلی گولی کی SIGNATURE TUNE[۱۳] تھی۔ جونہی دُشمن کی کمین گاہوں اور سمت کا اندازہ ہوا، ہماری طرف سے مشین گنیں دندنانے لگیں۔ توپیں گولے داغنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا دُشمن صفحۂ ہستی سے نابُود ہو جائے گا، لیکن جونہی ہمارا فائر بند ہوا پھر وہی ٹھک ٹھُوں شروع ہو گئی۔

رہا ہمارے جہاں بحق ہونے کا سوال تو وُہ کچھ پیدا نہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ اتفاق سے ہم اتنی بلندی اور فاصلے پر تھے کہ دُشمن کی گولیوں کی زَد سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چٹانوں پر بغیر اوٹ کے بیٹھے، دُوربین آنکھوں سے لگائے، میدانِ جنگ بلکہ کوہستانِ جنگ کا معائنہ کر رہے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم بالا نشینوں کا تعلّق تھا، پہلے دن کی جنگ اتنی خطرناک ثابت ہوئی جتنا سینما میں جنگی فِلم دیکھنا۔ لیکن ہمارے ساتھی جو دُشمن کی گولیوں کی زَد میں تھے ایسے خوش قسمت نہ نکلے۔ شام کو پتہ چلا کہ اِس دن ہمارے تین جوان مارے گئے۔

---

۱۳ شناختی سُر

قبائلی معرکوں کا سب سے دردناک سین وُہ ہوتا تھا جب قبائیلوں کے مکانوں اور بُرجوں کو گرایا یا جلایا جاتا تھا۔ آیئے یہ منظر دیکھیں:

ندی کے کنارے سبز اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو آج کل بالکل خالی ہے۔ سب مرد، عورتیں اور بچے پہاڑوں میں جا بیٹھے ہیں۔ کچّے لیکن صاف سُتھرے مکانوں میں قُفل پڑے ہیں۔ وُہ سامنے بڑی محرابوں والا مکان ہے جس کے ساتھ ایک بلند و بالا اور دلکش سا برج ہے۔ یہ غالباً گاؤں کے ملک کا مکان ہے۔ حفاظتی فوج کی آڑ میں سفر مینا کے چند دستے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کسی خاص شریر آدمی کا مکان اور کبھی گاؤں کا گاؤں زمین کے برابر کر دیتے ہیں۔ بڑے بُرج کا ِگرنا ایک نظارہ ہے جس پر ہر ایک کی آنکھ لگی ہوئی ہے اور جونہی اِس کی بنیادوں میں بارود کا دھماکہ ہوتا ہے چشمِ زدن میں وُہ سرو قامت بُرج چکنا چُور ہو کر ایک بے معنی سا ملبہ بن جاتا ہے۔ لیکن قبائلی اِس حرکت پر کچھ بے جا طور پر مشتعل نہ ہوتے۔ وُہ اِسے بھی جنگ کا ایک حصّہ سمجھتے۔ دِن کو اُن کے مکان مِسمار کیے جاتے، لیکن رات کو وُہ لوگ آتے، اپنی فصلوں کو پانی دیتے، ہل چلاتے اور مکانوں کا ِگرنا گویا ایک موسمی حادثہ سمجھتے اور دوبارہ تعمیر کر لیتے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا؛

اگر کسی دن کوئی آپریشن نہ ہوتا تو قبائلی تفریحاً ہی کچھ ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں ہفتہ بھر کیمپ سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک دن تو قبائلی خاموش رہے، لیکن دوسرے روز اِس پھیکی زندگی سے تنگ آکر اُنھوں نے غروبِ آفتاب کے وقت ہمارے کیمپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک گولوں گولیوں کی جوابی بارش نہ برسا دی گئی۔ ایسی کمیاب رونق مہیا ہونے سے بظاہر اُن کی تشفی ہو گئی، کیونکہ پھر وُہ آرام سے سو گئے۔

اس کے بعد ہر روز سرِ شام پہاڑ کے کسی کونے سے مِصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آ نکلتی اور یہ شعر گوئی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پوری غزل پیش نہ کر دی جاتی۔

ہم میں سے اکثر سامعین کے زمرے میں تھے اور اگرچہ باہر سے آنے والی گولی کا واجبی سا ڈر بھی رہتا تھا تاہم ہر شام کا تماشا کچھ ایسا جزوِ زندگی بن گیا تھا کہ کسی وجہ سے ناغہ ہو جاتا، تو ایسی مایوسی ہوتی جیسے سینما ہال میں داخل ہونے پر فلم کی نمائش روک دی جائے۔ اِسی تماشے کے دوران ایک شام ہمارا ایک خوش مزاج اور کہنہ مشق خچّر راہی مُلک عدم ہو گیا اور ہمارے سیشن میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ بقول نائیک حیات مُحمّد، آنجہانی کا "فیلڈ کرافٹ" کا عِلم اِس قدر پختہ تھا کہ اس کا ایک قبائلی کی گولی کی زَد میں آنا باور نہ آتا تھا۔

لڑائی کے دِنوں میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ دشمن سے نامہ وپیام بھی رہتا۔ بلکہ کئی روز ایسا ہوا کہ پانچ سات تنومند سے قبائلی ٹھوڑیوں کے نیچے سے پگڑیاں باندھے اور سفید چادریں تانے کیمپ میں آداخل ہوتے، کالم کمانڈر سے بات کرتے اور پھر اسی طرح سفید پھریرے اُڑاتے ہوئے تیز تیز کیمپ سے باہر نِکل جاتے۔ بات خُفیہ ہوتی مگر ہم تک مع تفسیر لنگر گپ کی شکل میں آ پہنچتی کہ قبائلی چند لاکھ روپے کے عوض صُلح پر آمادہ ہیں یا وُہ مزید ایک سال کے لیے لڑنے کا چیلنج دے گئے ہیں۔

غرض دوماہ تک یہی انداز رہااور جس جنگ سے بچنے کے لئے شیر باز ہمیں تکے کباب کِھلا کر بیمار کرنا چاہتا تھا وُہ نہایت ہی صحت افزا ثابت ہوئی۔ خود شیر باز کو اس زندگی سے عِشق ہونے لگا جس میں اور چیزوں کے علاوہ مُفت اور وافر راشن کا حصّہ بھی تھا۔

جنگ اگرچہ اَب ہفتے عشرے میں ختم ہونے والی تھی۔ تاہم شیر باز اور ہم ایک غیر معین عرصے کے لیے جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ اِتنے میں اچانک پشاور سے وائرلیس سے پیغام آیا:

”پشاور پہنچو، تمہاری جگہ پھر ٹام آرہاہے۔“

تھوڑی دیر بعد ایک اور پیغام آیا:

”ٹام کا انتظار کیے بغیر چل دو، میر اں شاہ میں ہوائی جہاز تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

حیران تھا کہ یا اللہ ایک خستہ نیم لفٹین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز سے بُلایا جا رہا ہے۔ بہر حال دتّا خیل کو ایک رومان انگیزی الوداع کہی اور پشاور پہنچتے ہی ایڈ جوڈنٹ صاحب کے حضور پیش ہوا۔ مجُھے دیکھ کر بولے:

”تم آ گئے؟ شاباش۔ اَب تُم سمندر پار جاؤ گے۔ تیاری کے لیے تمہیں دو دِن دیے جاتے ہیں۔“

حکم سُن کر باہر نِکلا تو آگے جان وائٹ کھڑا تھا۔ بولا: ”دیکھا، یہ اِن سار جنٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار ٹام کو جانا چاہیے تھا۔ وزیرستان کی لڑائی تو اَب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لیے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وُہ کل پرسوں آ جائے گا اور پھر یہ مزے سے برِج کھیلیں گے اور تُم؟ خُدا تمہاری حفاظت کرے۔ سر کو ذرا جھکا کر رکھنا!“

یہ سُن کر دِل کو سخت صدمہ ہوا۔ فوراً شیر خان کو طلب کیا اور تکِّے کباب کا آرڈر دیا۔ ساتھ ہی برِج کی کتاب منگوا کر مُطالعہ شُروع کر دیا۔

سات دن سمندر میں

ٹام کی جگہ ہمیں سمندر پار بھیجنا سخت فِرقہ وارانہ قِسم کا فیصلہ تھا۔ اگر ہم سولین ہوتے تو شاید بھُوک ہڑتال یا کم از کم رِٹ پٹیشن کا انتظام کرتے، لیکن فوجی افسر تھے، ضبط کا پاس تھا۔ یونہی عارضی ساماتھے پر بَل ڈالا اور سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے، لیکن شیر باز جو فوجی پابندیوں سے آزاد تھا، غصّے سے مغلوب ہو کر باہر بر آمدے میں جا کھڑا ہوا اور پشتو میں کیپٹن گِبن (ایڈجوڈنٹ) کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈالنے لگا اور اِس ضِمن میں چند ایسے گوشے بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مفادِ عامہ کی خاطر زیرِ نقاب رہنا ہی ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایڈجوڈنٹ صاحب وہاں موجود نہ تھے، لیکن ان کا بیرا جو ایک باریک ریشے کا مدراسی تھا، شور سُن کر اِدھر آ نِکلا۔ شیر باز نے بڑھ کر بغیر کسی تمہید کے اُسے دو مکے رسید کیے۔ جس سے مدراسی بے چارے کا شیرازۂ حیات تھوڑی دیر کے لیے مُنتشر سا ہو گیا، لیکن شیر باز نے اپنے مکّوں کی شانِ

نزول کی تشریح کرتے ہوئے اُسے تسلّی دی اور کہا:

"دیکھو مدراسی، اگر تمہارا صاحب موجود ہوتا تو یہ زحمت تمہیں نہ دی جاتی۔"

بعد میں شیر باز نے کسی قدر سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ایک منصُوبہ پیش کیا اور اِس کی فوری تکمیل کی اجازت مانگی۔ اِس منصُوبے کے خدوخال خانے جارحانہ تھے کیونکہ اِس کا مرکزی خیال کیپٹن گِبن کی زندگی کے اِردگرد گھُومتا تھا۔ شیر باز پر پیار تو بہت آیا کہ ایک مخلص مگر تیز طبع پٹھّان اِس سے بہتر کیا فنّی اِمداد پیش کر سکتا ہے، لیکن میرے اصرار پر شیر باز نے اپنی تجویز واپس لے لی البتّہ ایک شرط پیش کی کہ جس طرح ہو سکے بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ جاؤ، بلکہ ہماری بیماری کے لیے شیر باز نے تمام آسانیاں بہم پہنچا دیں۔ مثلاً وہی شِکم گداز کباب، چند زود اثر تعویذ اور بیسیوں تیر بہدف دُعائیں، لیکن پشاور میں ہمارے فقط دو دِن باقی تھے۔ پیشتر اس کے کہ شیر باز کے کباب کارگر اور دُعائیں مستجاب ہوتی ہمیں بمبئی کا ٹکٹ دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

پشاور سے چلتے وقت ہمیں ہدایت کی گئی کہ ایک دن راولپنڈی میں ٹھہر کر آرڈیننس ڈپو سے کیمپ کٹ یعنی سفری پلنگ اور غسل وغیرہ کا سامان حاصل کر لینا۔ پنڈی میں چند دوست مِلے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم سمندر پار جارہے ہیں تو انہوں نے ہمیں

اُسی حسرت سے دیکھا جس حسرت سے بِن کھِلے مُرجھائے والے غنچوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک رقیق القلب دوست کی ہمدردی تو کچھ تعزیت کی سی شکل اِختیار کر گئی جسے ہم نے بھی مظلومی بلکہ شہادت کے عالم میں قبُول کیا۔ اِن دِنوں یوں بھی غیر مُلکی آقاؤں کے لیے جان دینا کوئی برخورداری کی علامت نہ سمجھا جاتا تھا اور ہم پر تو مزید سِتم یہ ہوا کہ چند گوروں کی برِج کی خاطر مَوت کے مُنہ میں دھکیلے جا رہے تھے۔ بہر حال ان تمام ناگہانی، لیکن ذرا شِیر گرم بلاؤں کی دُعا مانگتے ہوئے جو ہمارے سمندر پار جانے میں حائل ہو سکتیں، ہم نے سفر جاری رکھّا۔ مثلاً یہ کہ ریل پٹڑی سے اُتر جائے اور ہمیں معمولی چوٹیں آ جائیں، مگر ہڈّی نہ ٹوٹے، لیکن گاڑی دعاؤں اور تمناؤں کو نظر انداز کرتی ہوئی صحیح و سالم بمبئی پہنچ گئی۔ گاڑی سے اُترتے وقت طبّی نقطۂ نِگاہ سے ہم فوری طور پر لڑائے جانے کے قابل تھے۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں رکھّا گیا۔ معلوم ہوا کہ جہاز دو دن کے بعد روانہ ہو گا۔ چنانچہ ہمیں حکم مِلا کہ ان دو دِنوں میں امبارکیشن آفس سے اپنے سفر کے کاغذات وغیرہ حاصل کر لو۔ عام لوگوں کو دفتروں سے کاغذات بر آمد کرانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے لیکن ہم عام آدمی نہ تھے، ایمپائر کے فدائی تھے۔ کفن بدوش نہ سہی لیکن شناختی تختی گلے میں ڈال رکھی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ امبارکیشن دفتر کے دروازے پر دستک دیں گے تو تمام افسر جو بہر کیف دوسرے درجے کے غیر لڑاکا قسم کے افسر ہیں، بصد تواضع

ہمارا استقبال کریں گے اور اگر ہمارے گلے میں ہار وغیرہ نہ بھی پہنا سکے، تو ہمارے کاغذات مِنٹوں میں تیار کر کے ہمارے حضور پیش کر دیں گے۔ آخر ہم اِنہی لوگوں اور ان کے بال بچّوں کی سلامتی کی خاطر ہی ہتھیلی پر جان رکھ کر عرصۂ کارزار کو جارہے ہیں۔ مگر دفتر میں گئے تو گھنٹہ بھر تو وُہ کمرہ ڈھونڈتے رہے جہاں سے ہمیں کاغذات ملنے تھے۔ دو گھنٹے بازیابی کے لیے انتظار کرنا پڑا اور جب آخر بازیابی کا وقت آیا تو دفتر کا وقت ختم ہو گیا۔

دُوسرے دن صحیح وقت پر گئے۔ اپنی جانبازی کا مغالطہ کیمپ میں ہی چھوڑ گئے۔ وطنِ عزیز کے دستور کے مطابق دفتر میں جا کر کسی واقف کا سُراغ لگانے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ ایک کلرک ہمارے ضِلع کا رہنے والا ہے۔ اُس سے مِلے اور ابھی چائے کی پیالی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کاغذات تیار ہو کر آ گئے۔

ٹرانزٹ کیمپ میں ہمارے چند اور جان فروش ساتھی سمندر پار جانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ شام کو اعلان ہوا کہ صُبح جہاز پر سوار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دُوسرے روز بندر گاہ پر پہنچے۔ یہ تھا جہاز اور یہ تھے ہم، لیکن سوار ہونے کا حکم نہیں مِل رہا تھا۔ پاس سے ایک حاکم نما سے حضرت گُزرے تو اُن سے وجہ تاخیر پُوچھی۔ بولے: ”کچھ نہیں ذرا کاغذی رکاوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“ یعنی وہی پُرانا قِصّہ تھا۔ کوئی فیتہ پرست افسر اپنے اَڑیل کلرک کی انگیخت پر کسی ضروری کاغذ پر بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ شام

ہو گئی اور ہر دو گُل مُحمّد اپنی جگہ سے ہلے نہ جہاز۔ ہمیں حکم مِلا کہ واپس کیمپ جا کر حکمِ ثانی کا انتظار کرو۔

معاً مجھے خیال آیا کہ شاید شیر باز کی دُعا میں DELAYED ACTION[۱۴] کی خصوصیت ہو اور اب وُہ آہستہ آہستہ قبُول ہو رہی ہو اور یہ کہ شاید ہمارا سمندر پار جانے کا حکم ہی منسوخ ہو جائے۔ ساتھی سوائے ایک کے سب انگریز تھے اور وُہ ایک نہ صرف ''گرائیں'' نِکلے بلکہ ہم خیال بھی۔ اُنہیں بھی انگریزی شہادت میں ایسی کشش نظر نہ آتی تھی؛ چنانچہ ہم دونوں نے ایک مُشترکہ دُعا مانگی:

''اے بحر و برَ کے مالک، ہمارا سمندر پار کا سفر ٹال دے۔''

کیوں اور کیسے، یہ باریکیاں ہم نے اللہ میاں پر چھوڑ دیں۔ ہم نے دُعا کے اِس پہلو پر البتّہ بہت زیادہ زور دیا کہ فوری توجہ کی مُستحق ہے، لیکن خُدا جانے ہماری دُعا میں کوئی ٹائپ کی غلطی رہ گئی تھی یا لیبل غلط لگ گیا تھا، صُبح جاگے تو حکم ہوا کہ جہاز سہ پہر کو لنگر اٹھائے گا۔ مُسافر بارہ بجے بندر گاہ پر پہنچ جائیں۔ اُسی شام ہم اپنے کیبن میں بیٹھے

---

۱۴ تاخیری عمل: عام طور پر اُس بم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ایک خاص وقفے سے پھٹتا ہے۔

مغرب کو رواں تھے۔

ہمیں اتنا ہی اندازہ تھا کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ منزلِ مقصُود کونسا مُقام ہے۔ لڑائی اِن دِنوں مصر سے آگے لیبیا میں مسولینی کی فوجوں کے خلاف ہو رہی تھی؛ چنانچہ خیال تھا کہ سویز یا پورٹ سعید اُتریں گے، لیکن دُوسرے روز ہی کسی نے کان میں آکر کہا: "بصرہ اُتریں گے، لیکن بتانا کسی کو نہیں۔" ہم نے کسی کو نہ بتایا یعنی سوائے اپنے دوست کے، لیکن اُسے پہلے ہی سے عِلم تھا اور ہمیں بتانے کے لئے بے تاب تھا۔ چند گھنٹوں میں سب کو معلوم ہو گیا لیکن سرکاری طور پر ہماری منزل بڑی کامیابی سے خُفیہ رکھی جا رہی تھی۔ پچھلے پہر جہاز کے ملازم سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم ستمبر ۱۹۴۱ء کی صُبح کو بصرہ پہنچیں گے۔ یہ تفصیل غالباً TOP SECRET (خُفیہ ترین) شُمار ہو رہی تھی۔

جہاز کے لنگر اُٹھانے کے بعد بظاہر کوئی ایسا امکان نہ تھا کہ ہمارے سفر جنگ میں کامیاب رکاوٹ پڑ سکے؟ لہٰذا جہاز کو خانۂ خویش سمجھ کر اُس کے کوچہ و در دیکھنا شروع کیے۔ ہمارا پہلا سمندری سفر تھا۔ جہاز کا کونا کونا دیکھ مارا، لیکن شاید یہ ہماری فالتو چُستی کا فیض تھا کہ اچانک جہاز نے ہمارے پاؤں سے نکل کر ہمارے گِرد چکر لگایا۔ ہمارے اعضاء نے یکے بعد دیگرے ہمیں خیر باد کہا اور ہم بمشکل سَر کو تھامے کیبن میں پہنچے اور دراز ہو گئے۔

یہ سمندری علالت بھی عجیب علالت ہوتی ہے۔ اچھّا بھلا آدمی بیٹھے بیٹھے اپنے آپ پر گرفت ڈھیلی پاتا ہے۔ ہوش و حواس درست ہیں، لیکن اُن کی درستی کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اعضاء پر اختیار نہیں۔ اِس مکمّل بے بسی کے عالم میں زندگی پر ایک گہری یبوست محیط ہو جاتی ہے اور غریب مُسافر اپنے آپ کو بھرے جہاز میں مجبور و معذور پاتا ہے۔ اس بے چارگی میں ہمارا دستگیر ایک گوانی مُلازم بنام لوبو تھا۔ لیکن لوبو شوقِ خدمت میں فقط دستگیری کا قائل نہ تھا۔ اگر آپ کو ان دنوں جہاز "اسلامی" سے سفر کا اتفاق ہوا ہو اور لوبو کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقع مِلا ہو تو آپ مُجھ سے اتّفاق کریں گے کہ لوبو کے فن پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنا مُناسب نہیں۔ مختصر یہ کہ اُستاد لوبو بڑے صحّت بخش فنکار تھے۔

سفر کا دُوسرا اہم واقعہ ایران کی جنگ تھی۔ ہر صبح اور شام جہاز کے ڈرائنگ رُوم میں وائرلیس سے مرتّب کردہ خبر نامہ بورڈ پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ روانگی کے دُوسرے یا تیسرے روز خبر آئی کہ اتّحادیوں نے ایران پر حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے یہ حملہ ہندوستانی فوج ہی کے چند دستوں کی مدد سے کیا تھا؛ تاہم ہمیں ایرانی بھائیوں سے بھی ہمدردی تھی۔ ہمارے انگریز ہم سفر ایرانی فوجوں کا مذاق اُڑاتے تھے، لیکن ہم چاہتے کہ اگر وُہ جیت نہ بھی سکیں، تو دادِ شجاعت دے کر ہاریں، چنانچہ دُوسری صبح ہم کسی قدر بے تابی سے خبر نامہ پڑھنے گئے، لیکن یہ سُرخی دیکھ کر ہمیں حیرانی ہوئی کہ

ایران میں ہر طرف امن و امان کا دَور دَورہ ہے۔

تفصیل اِس اجمال پُر ملال کی یہ ہے کہ انگریزوں اور رُوسیوں نے ایک دن کسی اِشتعال کے بغیر ایران پر حملہ کر دیا۔ اہلِ ایران کو اس بد تمیزی پر غصّے سے زیادہ حیرت ہوئی اور پیشتر اِس کے کہ غُصّہ آتا اور اس کے اظہار کے لیے میدانِ جنگ میں اُترتے، دغاباز حملہ آوروں نے میدانِ جنگ سمیت ایران پر قبضہ کر لیا۔ حق بات یہ ہے کہ ایرانی بے خبری میں مارے گئے۔ ویسے ان کی فوجی قوّت کا معیار بھی وُہ نہ تھا جو آج ہے۔ یہ اِسی لڑائی کا شاخسانہ تھا کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی تخت سے دستبردار ہو گئے اور موجودہ شہنشاہ مُحمّد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہوئے۔

بمبئ سے بصرہ تک ایک ہفتے کا سفر تھا جو ایسا طویل تو نہ تھا لیکن آخری دو تین دن تو ہم خشکی کے لیے ترس گئے۔ ہر طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ چھوٹا سا جہاز تھا اور تھوڑے سے مسافر اور سب کے سب مَرد۔ متواتر وہی چہرے دیکھ دیکھ کر ایک دُوسرے سے تنگ آ گئے تھے اور چند ہم سفروں کی دید تو بے حد اِشتعال انگیز تھی۔ پاس سے گُزرتے تو جی چاہتا کہ اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیں، لیکن اَغلب ہے کہ وُہ بھی ہماری شکل و صُورت سے بیزار ہو کر خونِ جگر پی رہے تھے۔ بہر کیف دونوں فریقوں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اور باہمی رَواداری کا پردہ سرِ عام چاک نہ ہوا بلکہ جی کڑا کر کے ایک دُوسرے سے علیک سلیک بھی کرتے رہے۔

آخر چھٹے دن غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے ایک صاحب خوشی سے چلّا اُٹھے: ''وُہ دیکھو خشکی۔'' ساری عُمر خشکی پر گُزاری تھی اور اِس عرصے میں غالباً اسے دیکھا بھی ہو گا، لیکن اُس روز محسوس ہوا کہ سَچ مُچ ہم خشکی دیکھے بغیر ہی اِس پر قیام پذیر رہے ہیں۔ چنانچہ بالکل اُسی انداز سے جیسے سرکس دیکھتے ہیں، ہم نے زمین کے اِس کونے کو دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد شط العرب میں داخل ہوئے تو دونوں طرف دُور فاصلے پر کھیت اور اِنسان نظر آنے لگے۔ انہیں دیکھنا تھا کہ ہمارے دِلوں میں بھی بنی نوعِ اِنسان کے لیے جن میں ہمارے ساتھی بھی شامل تھے، محبّت کے چشمے پائے گئے۔ ایک دُوسرے کو سمندر میں پھینکنے کے ناپاک منصوبوں کا شرمندگی سے اعتراف کیا اور پشیمان انگریزوں کی طرح اُنہیں ''واپس'' لیا۔ جب ڈِنر سے فارغ ہو کر اپنے کمروں کو لوٹے تو جہاز پر ایک مکمّل اور پُرامن بقائے باہم(PEACEFUL CO-EXISTENCE)کا عالم تھا۔

صبح ہوئی اور جاگے تو ہمارا جہاز بصرے کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ بڑے اشتیاق سے باہر جھانکا کہ اِس نئے مُلک کا ناک نقشہ تو دیکھیں۔ ایک نوٹس بورڈ پر نظر پڑی، لِکھا تھا:

''سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے ہوشیار رہیں۔''

اطمینان ہوا کہ الف لیلیٰ کی اِس رومان انگیز سرزمین اور ارضِ ہند میں کم از کم ایک قدر

ضرور مُشترک ہے۔ لیکن سوچا کہ عراق اور ہندوستان کی مشابہت کا یہی عالم ہے، تو ہمارا سفر بیکار رہا۔ کیا اس سے یہی بہتر نہ تھا کہ پشاور میں ہی اپنے مال و اسباب کی خبر داری کرتے رہتے۔ لیکن آئندہ چند ماہ میں جب بصرہ و بغداد کو ذرا قریب سے دیکھا اور وہاں کی زندگی کے کچھ دُوسرے گوشے بے نقاب ہوئے تو معلوم ہوا کہ اِس خطّے کی رنگینیاں ختم نہیں ہو گئیں بلکہ:

آج بھی اِس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تِیر آج بھی ہیں دل نشین

بصرہ اور شائبہ کیمپ

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا، تاہم ذہن اِس کے تصوّر سے یکسر خالی نہ تھا۔ مثلاً بچپن میں جغرافیہ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا، اُس سے بصرے کا تصوّر سُرخ میٹھی کھُجوروں کی شکل میں ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ اُنہی دِنوں کے اِمتحانوں کے گھوٹے کی پسماندہ یاد یہ بھی تھی کہ بصرہ لندن یا ٹمبکٹو کے رَستے میں ایک بحری یا ہوائی اڈّہ ہے۔ اگرچہ اس اڈّے کا تصوّر مزنگ کے ٹانگوں کے اڈّے سے مختلف نہ تھا، پھر بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بَصرہ کے قِصّے سُنے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں اِسی بندر گاہ پر اُتر کر میسوپوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے یا یوں کہیں کہ بیکار گئے تھے۔ کام آنے والوں نے آ کر کیا قصّے سُنانے تھے؛ اور بعد میں شاید اِن ہی فوجیوں کے طفیل بَصرہ ہمارے لوگ گیتوں میں بھی گھُس گیا تھا۔ مثلاً وُہ پنجابی گانا:

چھٹی رَن گئی، بَصرے نوں گئی

تے موڑیں باواڈانگ والیا

(اگرچہ گیت کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود خاتون نے بَصرے میں گھُسنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟)

جہاز سے اُترے تو معلوم ہوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں، بلکہ بصرے سے کوئی پندرہ میل مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شائبہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلُوم ہوا کہ اِس مُقام کا عربی نام توشعیبیہ ہے لیکن اِس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سِلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے مُلک میں بھی آشنا تھے۔ مثلاً حیدر آباد کا انگریزی نام ہائیڈرابیڈ تھا اور کشمیر کا کیشمیہ۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سِکھّا شاہی مچا رکھی تھی۔ مثلاً بغداد بیگ ڈیڈ تھا۔ موصل کو موزل کہتے تھے اور معقل کو مارگل بنا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بضاعتی کی وجہ سے شاید غلط تلفّظ پر مجبور تھے، لیکن حیرت بلکہ رحم اُن ہندوستانیوں پر آتا تھا جنہیں اپنی فلاح بیگ ڈیڈ کہنے میں ہی نظر آتی تھی۔

سرزمینِ عراق کے وُہ پندرہ میل جو بصرہ اور شائبہ کیمپ کے درمیان تھے، ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ تھے۔ ہم نے اِس سے پہلے کبھی ایسا اصلی ریگستان نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو دجلہ کی گُزرگاہ کے طفیل بہت سرسبز اور شاداب تھا اور کھُجوروں کے

درخت تو وہاں اِنسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرے سے باہر نکلنا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب۔ حدِّ نگاہ تک لق و دق اور ہموار ریگ زار تھا جس میں کسی عمودی شے کا وجود نہ تھا، سوائے کسی بھٹکے ہوئے گدھے یا بہکے ہوئے اُونٹ کے جو دُور اُفق پر نظر آتے تھے۔ اگرچہ اُن کے وہاں ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ پانی تھا، نہ نباتات۔ بقول حالی "خُدا کی زمین بِن جتی سر بسر تھی۔" ممکن ہے کہ اس ضمن میں گدھوں اور اُونٹوں کا کوئی اپنا زاویۂ نِگاہ ہو۔ لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اُن کے تاثرات معلوم کر سکتے۔ ہمارا قافلہ رواں تھا اور ہم برابر دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں گھاس کی واحد پتّی ہی نظر آ جائے۔ لیکن نہ آئی۔ سعدی کا شعر یاد آیا:

برگِ[15] درختانِ نیز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور محسوس ہوا کہ ہم خواہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، شائبہ کے نواح میں ہمیں معرفت کردگار ذرا مُشکل سے ہی میسّر ہو گی۔ ہمارے ایک ساتھی جو سید تھے۔ بولے:

"بجا کہتے ہو دوست، شائبہ کردگار سے زیادہ کربلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتّے دیکھ کر

---

[15] ایک عقلمند آدمی کی نگاہ میں درختوں کے پتّے بھی خُدا کی معرفت کا دفتر ہیں۔

نہیں بلکہ سَر دے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔"

سوچا کہ اگر سعدی شیر از کی بجائے شائبہ میں پیدا ہوتے، تو معرفت کا یہ آسان نُسخہ تجویز نہ کر پاتے۔

شائبہ کیمپ میں پہنچے، تو پہلی مرتبہ اِنسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کے سپاہی۔

شائبہ ایک RE-INFORCEMENT CAMP[۱٦] تھا۔ یعنی اِس میں فوجی لوگ محاذِ جنگ پر بھیجنے کے لیے تھوک کے طور پر رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ہمارے دو ڈویژن محاذ پر تھے اور ان دونوں کو کمک شائبہ سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی، کیا افسر، کیمپ میں مسافر تصوّر ہوتے تھے اور کیمپ میں آنے کے بعد چند دِنوں میں آگے محاذ پر بھیج دیے جاتے تھے۔ لیکن یہاں خُدا کے کچھ پُراسرار بندے ایسے بھی تھے جنہیں فطرت نے مُفت خوری کا لازوال شوق بخشا تھا اور جنہوں نے تمام تر جنگ شائبہ کے لنگر خانوں اور مَیسوں میں ہی گزار دی تھی۔ فوج میں ہمیشہ دو قِسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وُہ جو لڑ کر جنگ جیتتے ہیں اور وُہ جو کھا کر جیتتے ہیں۔ شائبہ کیمپ میں دونوں قسمیں پائی جاتی تھیں۔ جگر گداز منظر اُس گھڑی ہوتا تھا جب ایک کھا کر جیتنے والے کو محاذِ

---

۱٦ امدادی لشکر گاہ

جنگ پر جانے کا حکم مِلتا تھا اور غریب ٹال نہ پاتا تھا۔ ہم نے چند ایسے مناظر دیکھے اور ہر مَرتبہ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔

ایک کپتان صاحب کا وقتِ سفر کبھی نہ بھُولے گا۔ یہ حضرت شائبہ کے بانیوں میں سے تھے اور آپ نے اپنا تمام وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا جس کا مرکز کیمپ کا میس تھا۔ حضور کا بڑا ثقیل سا نام تھا جو چھوٹی "ی" پر ختم ہو تا تھا۔ مزاج میں رنگینی تھی اور اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سُنایا کرتے تھے، بلکہ اُن دِنوں اپنی مُراد آبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصُوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا ذرا اَٹل سا حکم مِل گیا۔ کیا بتائیں کہ اس مُجاہد نے اِس مہم سے بچنے کے لیے کیا کیا بہانے تراشے؟ آپ نے جملہ انگریز افسران کو آوازِ بُلند خبر دار کیا کہ یاد رکھو! اگر ہمیں محاذ پر بھیج دیا تو شائبہ ویران ہو جائے گا۔ ہندوستانی فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ پیچھے مُراد آباد کا WAR EFFORT[۱۷] برباد ہو جائے گا اور اُدھر سلطنتِ برطانیہ کا مُستقبل تاریک ہو جائے گا۔ دلائل بے شک وزنی تھے لیکن ظالموں نے ان کا وزن کرنے سے ہی اِنکار کر دیا اور آپ کو اُس لاری پر سوار ہونا ہی پڑا جو ایک صُبح محاذ کو کمک لے کر جاری تھی۔ اِس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنھیں دیکھ کر سارے شائبہ پر رِقّت طاری ہو گئی، لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ

---

[۱۷] جنگی تیاریاں

حاضرین میں ایک بے پناہ قہقہہ گونج اُٹھا۔ ایک دِل جلے نے مراد آبادی معشُوقہ کو پُکار کر کہا:

''تو نیز بر سَر بام آکہ خوش تماشا ایست''

اِس وسیع کیمپ کے دو حصّے تھے، جنھیں وِنگ (WING) کہتے تھے۔ یعنی برٹش وِنگ اور انڈین وِنگ۔ برٹش وِنگ میں فقط گورا افواج تھیں اور اُن کے افسر۔ یہ وِنگ کیمپ کے غربی سِرے پر تھا۔ مشرقی حصّہ انڈین وِنگ تھا۔ اس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اور اُن کے افسر رہتے تھے۔ اُن دِنوں انڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریزی ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ دیسی افسر بھی خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ اُن دِنوں میں ہندو، مُسلمان، سِکھ، پارسی سب تھے جو باہم شیر و شکر تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مُسلم دنگل تھا جس میں اکثر سکھ بھی مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے اور فقط پارسی ہی اس بزمِ خیر و شر کو ساحل سے دیکھتے تھے، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خُدا واسطے کا بیر تھا تو صرف انگریز افسروں سے۔ ہندوستان کی محکومی کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حسّاس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریزوں سے اُلجھنے کو جی چاہتا تھا، لیکن جنگ چھڑنے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں بھی قصابوں اور کنجڑوں

کی بھرتی ممنوع نہ تھی۔ پھر عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ اُن دِنوں ہم سے تقریباً ہمیشہ سینئر ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھّی خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے مَیسوں میں بارہا نقصِ امن کی وارداتیں ہوئیں۔

شائبہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین وِنگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے، تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چنانچہ خوشی ہوئی کہ شائبے کا چند روزہ قیام خوب گُزرے گا مگر ابھی بستر بھی نہ کھُلا تھا کہ حکم مِلا: "تُم برٹش وِنگ میں قیام کرو گے۔" وجہ یہ بتائی گئی کہ اِس کیمپ میں صرف رائل سِگنلز کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین سِگنلز کا کوئی آدمی یا ٹھکانہ نہ تھا۔

چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لیفٹینینٹ کو اپنی برادری سے اُدھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدّد کی ایک اور مثال تھی لیکن کانگرسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔ بس دانت پیس کر زیرِ لب ہی اپنے جذبات کا اظہار کر لیا۔ دِل ہلکا ہوا تو بوریا بستر اُٹھایا اور برٹش وِنگ جا پہنچا۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے۔ کیا افسر کیا سپاہی، بلکہ بیرے خانسامے تک انگلستان ساختہ تھے۔

ایک گورا سپاہی ہمیں بطورِ اردلی ملا۔ اُس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کیے

ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھّا۔ جوتے پالش کئے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں دِن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے ہماری صاحبقرانی کی ابتدا ہو رہی ہے۔ معاً ہمارے خسروانہ ذہن میں یہ خیال آیا کہ سب انگریزوں کو بد دماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم اس گورے غلام کے لیے اَب سراپا شفقت تھے۔

جب گورا کارِ خدمت سے فارغ ہو چُکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہم کلام ہوا، لیکن کلام کیا تھا، ایک لہراتی سی انگریزی نُما آواز ہمارے سامنے سے گُزر گئی۔ لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابلِ فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی لیکن ہمارے دماغ کے نقش بدستور دُھندلے اور تجریدی قِسم کے تھے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کہ کیوں نا ہم ہی کچھ کہیں؛ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہارِ مُدعا کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی کی داد میں ایک مخلصانہ مُسکراہٹ ضرور پیش کی، لیکن جہاں تک اِس انگریزی کے اِدراک کا تعلّق تھا، ظاہر تھا کہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطۂ اِتّصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشقِ سخن جاری رکھی، تو ہماری انگریزیاں بالکل متوازی پگڈنڈیوں پر ایک دُوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بِلا تکلّف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقول راغ:

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

شام کو برٹش ونگ کے افسروں سے مُلاقات ہوئی۔ یہ گورے اردلی سے بھی زیادہ تواضع اور احترام سے پیش آئے۔ پہلے تو حیران ہوا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو لیکن فوراً معلوم ہو گیا کہ اِن کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے۔ یعنی یہ کہ اِن انگریزوں نے ابھی تک ہندوستان نہیں دیکھا اور فرعونیت کا اِنہیں عملی تجربہ نہیں ہوا۔ وُہ لوگ سیدھے ولایت سے شائبہ آئے تھے اور ایک غیر مُلکی کو انگریزوں کی خاطر لڑتا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے تھے، جیسے دنیا بھر کے مُسلمان مُحمّد علی کلے کے قبولِ اسلام پر مسرور ہوتے ہیں۔ آج مُحمّد علی کسی اِسلامی مُلک میں آ نکلیں تو لوگ دیدہ و دِل فرشِ راہ کر دیں۔ انگریزوں نے اس قسم کے اعضائے رئیسہ تو ہمارے رستے میں نہ بچھائے، لیکن ان کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا۔ یعنی تپاک سے مصافحہ کیا۔ چائے پلائی، لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وُہ اُن کا اندازِ ملاقات تھا۔ جو بھی مِلتا اُس کے چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی گفتگو سے سَرپرستی اور بے نیازی نہ ٹپکتی تھی جو ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔ وُہ اپنے مخاطب کو اپنے برابر بھی سمجھتے تھے اور قابلِ عزّت بھی۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن میں طبعاً اتنا ٹامی مزاج بھی نہ تھا کہ اِن لوگوں سے گھُل مِل جاتا۔

محض مصافحوں یا مسکراہٹوں پر مستقل گزارا مُشکل تھا۔ برٹش وِنگ میں آرام ضرور تھا لیکن گوشۂ قفس کے آرام سے مِلتا جلتا اور پھر زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں، بلکہ اگر آتش جواں ہو، جیسا کہ وُہ تھا، تو فالتو آرام ایک عجیب بدنی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ جی چاہتا کہ بھاگ کر کیمپ کے ہندوستانی حِصّے میں جاؤں اور اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مِل کر اُودھم مچاؤں۔ اور کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ ایک دن انڈین وِنگ میں گورکھا سپاہیوں کو سِگنل کی تربیت دینے کے لیے ایک افسر کی ضرورت محسوس کی گئی اور نظرِ انتخاب ہم پر پڑی۔ چنانچہ بظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ لیکن بباطن ہزار بے تابی سے انڈین وِنگ میں پہنچے اور دو نفل شکرانے کے پڑھے۔

برٹش وِنگ کی دھیمی دھیمی بے آواز سی فضا سے نِکل کر انڈین وِنگ کی رنگ رنگیلی دُنیا میں پہنچا، تو یوں محسوس ہوا جیسے انارکلی میں آ نِکلا ہوں۔ وہی انارکلی کے رنگ و صُورت اور وہی گہما گہمی، لیکن عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دیسی افسر نظر نہ آرہا تھا؛ البتّہ ایک قریب کے خیمے سے قہقہے بلند ہو رہے تھے جو لاریب افسرانہ تھے۔ چِق اُٹھا کر داخل ہوا تو سبھی کو یکجا پایا۔ مختار، قاضی، اصغر، بتالیہ، بھاٹیہ، کیانی، امیر، سوامی، نینے، نادر اور کئی دُوسرے جن سے ابھی تعارف نہیں تھا، ہماری آمد کو حسبِ معمول ایک ایسے نعرے سے منایا گیا جس کا اثر شائبے کے دیگر خیموں میں ایک ہلکے سے زلزلے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پُوچھا کہ فرزندانِ ہند اس بند تمبو میں بیٹھے کیا سازش کر رہے

ہیں، تو بتایا گیا کہ کونسل آف ایکشن کا اجلاس ہے۔

ہوا یہ تھا کہ ایک انگریز میجر بنام مِڈوے (MEDWAY) نے کیپٹن اجندر سنگھ بتالیہ کے خلاف ایک کیس کھڑا کر دیا تھا یا بزبانِ فوج اُنہیں چارج پر رکھ دیا تھا۔ فردِ جرم میں مذکور تھا کہ مُلزم کو کیبرے دیکھنے کے لئے شائبے سے بصرہ جاتا تھا۔ کوئی اور سواری نہ مِلی تو آرمرڈ کار یعنی بکتر بند گاڑی لے کر تماشہ دیکھنے چلا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اَب ایوان کے سامنے سوال یہ تھا کہ بتالیہ کیا صفائی پیش کرے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ مُلزم ارتکابِ جرم سے صاف اِنکار کرے اور ثبوت میں نائک پینداخان ڈرائیور سے شہادت دِلوائی جائے۔ دُوسری تجویز یہ تھی کہ مُلزم ڈٹ کر اقبالِ جرم کرے لیکن ٹریننگ کا بہانہ کرے۔ اگر پُوچھا جائے کہ یہ حرکت سرِ شام کیوں کی گئی تو عدالت کی توجہ نائٹ ٹریننگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریننگ کیبرے پر کیوں جا کر ختم ہوئی تو اس کی وجہ COMPASS ERROR یعنی قطب نُما کی غلطی بتائی جائے۔

مُجھے یہ دُوسری تجویز کچھ مذاق سا معلوم ہوئی لیکن دُوسرے روز بتالیہ نے کورٹ کے سامنے یہی صفائی لفظ بلفظ پیش کر دی۔ عدالت نے، جس کے ارکان یقیناً اہلِ دل تھے، اپنے فاضلانہ فیصلے میں لکھّا کہ کوئی جرم سَرزد نہیں ہوا۔ کیپٹن بتالیہ کو ایک بہتر قُطب نُما مہیا کیا جائے!

قصّہ مُختصر اگلی مرتبہ بتالیہ صاحب کیبرے دیکھنے گئے تو ٹینک میں تشریف لے گئے۔ ہرچند کہ انہیں ایسی سواری کی ضرورت نہ تھی، یہ حرکت محض میجر مِڈوے کی خوشنودئ مزاج کے لیے کی گئی تھی۔ مِڈوے نے جب یہ خبر سُنی تو اُس سے زیادہ بے بس اور مضمحل انگریز برطانوی سلطنت میں اور کوئی نہ تھا۔ بے بس اِس لیے کہ ابھی ابھی ایک نیا قُطب نُما بتالیہ کو دے چُکا تھا۔ زبان کھولتا تو نیا ٹینک بھی پیدا کرنا پڑتا۔

کیپٹن بتالیہ کی مُہم نے میجر مِڈوے کی شکایتوں کا تقریباً قلع قمع کر دیا لیکن اُس کی بدتمیزی کا اِنسداد مُشکل تھا۔ میجر مِڈوے کی بدتمیزی کچھ خُداداد سی چیز تھی اور اِس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اُسے قُربِ خاص حاصل تھا اور کسی مغالطے کے تحت اُس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا اور اب اِس بیکراں دولت کو اِس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیبِ استعمال پر داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مُجھے میجر صاحب سے کام پڑ گیا۔ اُن کے دفتر میں حاضر ہوا اور دروازے پر کھڑے ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

”مَیں ایک سیکنڈ کے لیے اندر آسکتا ہوں؟“

میجر صاحب بولے ”ہاں آؤ“

اندر داخل ہو گیا اور ابتدائے کلام کرنے لگا تو گھڑی دیکھ کر بولے:

"ایک سیکنڈ ہو گیا ہے آپ جاسکتے ہیں!"

بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیڑھ سیکنڈ ہو گیا تھا۔ مؤدبانہ سلیوٹ کیا اور باہر آ گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میجر صاحب کی بد تمیزی پر پیار بھی آیا لیکن بد قسمتی سے یہ بد تمیزی کی قدر اُن کی پریشانی کا باعث بنی۔ ہوا یہ تھا کہ میں میجر صاحب کے پاس اُن کی ہم کلامی کا شرف حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری کام سے گیا تھا۔ مُجھے کیمپ کے کمانڈانٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ میجر مِڈوے کو پہنچادینا۔ ایک سیکنڈ کی مہلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ چنانچہ دوپہر کو جب کرنل صاحب لنچ پر مِلے تو اُنہیں واپس کر دیے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کر دی۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں میجر مِڈوے اور کرنل صاحب کے درمیان کیا گزری، البتّہ بعد ازاں جب کبھی ہم نے میجر مِڈوے کے دروازے پر دستک دی تو وُہ یہ نہیں پُوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو، بلکہ یہ کہ کیا لائے ہو اور جی کڑا کر کے ایک باکفایت سی مُسکراہٹ کا انتظام بھی فرمادیتے۔

سچ تو یہ ہے کہ میجر مِڈوے کی بد تمیزیاں ہماری زندگی کا حصّہ بن گئی تھیں۔ لیکن بد قسمتی سے ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد میجر صاحب خوش تمیزی پر

اُتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا یعنی ہم ہوئے کافر تو وُہ کافر مُسلماں ہو گیا۔ اور خالی مُسلمانی نہیں، پکا حاجی بن گیا۔

لیکن جس چیز نے قصبہ شائبہ کو رنگین کر دیا وُہ غریب مِڈوے کا لہو نہ تھا بلکہ خُوبانِ بصرہ کے لَب و رُخسار کا غازہ تھا۔ بصرہ شائبے سے بہت دُور نہ تھا۔ کی کوئی چودہ پندرہ میل۔ چنانچہ ہماری ہر شام بصرہ میں گُزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صُبح کو وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی، لیکن خواتینِ عراق سب کی سب لالہ رُخ اور سَمن بر ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سَمن کسی قدر افلاس کے خش و خاشاک سے آلودہ تھا لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے متوالے ہندوستانیوں کے دِل و دماغ کو معطّر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بھکارنیں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں تو بغیر تعارف کے جونیر مہارانیاں بن جائیں۔ اِس قدر بے محابا حُسن کو یوں چیتھڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دُکھنے سا لگا، بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا تو تڑاق سے اُسے جوتے خرید دیے۔ فرمانے لگے:

"کیا سِتم ہے یار، پھُولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلیں، میری

حمیت کو گوارا نہیں۔"

لیکن بعد میں جب ایسی گُل اندا موں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے جو بِلا تکلّف بَصرہ کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں، تو کسی قدر سراسیمہ سے ہو گئے۔ غالباً دِل ہی دِل میں آپ نے اپنی پُونجی کو اِن برہنہ پا حسیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصِل قِسمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک اُنگلی بھی ڈھک سکے۔ اِس سادہ تقسیم کے سوال نے انہیں گہری رومانی دُنیا سے نِکال کر بَصرے کے تپتے چوک میں لا کھڑا کیا؛ چنانچہ اب وُہ بے پاپوش دوشیزاؤں کو دیکھتے تو ان کی حمیت کو کوئی واضح ٹھیس نہ لگتی۔

لیکن بَصرہ میں باپاپوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی سِتم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا تو، ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں ایک ننّھا سا پیارا سا ایٹمی وار ہیڈ نصب تھا۔ ساتھ ہی اِس سراپا ناز کو دھول دھپّا سے بھی خاص پرہیز نہ تھا۔ چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹُوٹ پڑی اور غریب کسی پیش دستی کے بغیر اُس خاتون کے ذُو لغل حملے کا شکار ہو گئے اور ہفتہ بھر کسی کو مُنہ بلکہ سر دِکھانے کے قائل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلُوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ اِستعمال ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں، بلکہ یہ حوّا کی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار رہے۔ بہر حال محض جوتے کا بپا کردہ حَشر ایسی چیز نہ تھی جس سے ہمارے دوست سے جنونِ عشق کے انداز چھُوٹ جاتے، چنانچہ چند ہی دِنوں میں آپ کے نہ صرف بال اُگ آئے بلکہ اس زود

پشیماں خاتُون کے دِل میں مہر و محبّت کے چشمے بھی اُبلنے لگے۔ آج کل جب بھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں مِلتے ہیں تو ہم شرارتاً سکول کے دِنوں کا مِصرع گنگناتے ہیں:

المدد پاپوشِ جاناں سر مِرا کھُجلائے ہے!

لیکن حسینانِ بَصرہ کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہوٹل کی وُہ رنگین شام کہ اُس کا وسیع دالان حسینوں سے پُر تھا اور لیفٹیننٹ کیانی ایک فتنۂ روزگار پر کھڑے کھڑے دِل لُٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وُہ کافرہ اِس خراجِ عظیم کی مُستحق تھی؛ تاہم اس کا انتخاب اِس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ بیاہتا تھی اور اپنے دُولھا کے عین پہلو میں بیٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ عراقی نصرانیوں میں سے ہے اور مِسز الیاس کہلاتی ہے۔ اُس کے دولہا میاں اِس قدر واضح طور پر بے ضرر اور تہ دِل سے یتیم نظر آتے تھے کہ کیانی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور خارج از بحث کر دیا، پھر اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُٹھ کر مسز الیاس کے قدم جا لیے اور اُس سے تخلیے میں بات کرنے کی التجا کی۔

مِسز الیاس کی زندگی میں کیانی غالباً پہلے پُجاری نہ تھے جنھوں نے اُس کے قدموں پر دل کی بھینٹ چڑھائی ہو؛ چنانچہ اُس نے سکون اور وقار کے ساتھ اجنبی کی التجا سُنی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ گویا کہتی ہو کہ یہ وُہ مقام ہے جہاں جواب دینا خاوند کا

کام ہے اور کتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو، یہ آگ بگولا ہونے کا وقت ہوتا ہے؛ چنانچہ خاوند موصوف حسبِ توفیق آگ بگولا بھی ہوئے اور اُٹھ کر کچھ کر مرنے کو بھی تھے کہ کیانی نے اُن کے سر کو ہاتھ سے دبا کر کرسی پر بِٹھا بلکہ چپکا دیا۔ کیونکہ اس کے بعد مسٹر الیاس نے اُٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اب اُن میں آگ باقی تھی نہ بگولا۔ بس ایک فیل شُدہ خاوندیت لے کر حالاتِ حاضرہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔

اَب مُعاملہ مسز الیاس اور کیانی کے درمیان تھا۔ مِسز الیاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیانی کو ایک واجبی قہر سے دیکھا، پھر اُٹھی اور اُٹھ کر اُس کے رُخسار پر ایک ہلکا سا تھپّڑ لگایا۔ وہی تھپّڑ جو مردانہ بدتمیزیوں کا روایتی نِسوانی جواب ہوتا ہے۔ اِس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصود نہیں ہوتا؛ البتّہ اس کا اخلاقی گھاؤ خاصا گہرا ہوتا ہے۔ اِس تھپّڑ کو کیانی نے ایک گونہ اطمینان سے برداشت کیا۔ بظاہر اُن کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔ اگلے لمحے میں مِسز الیاس کا روئے سخن اس چیز کی طرف تھا جو اس کا خاوند کہلاتا تھا۔ اس قابلِ احترام خاتُون نے پہلے تو اُسے گہری حقارت کی نِگاہ سے دیکھا اور پھر اُس کے بائیں گال پر ایک سنسناتا تھپّڑ جما کر حقِّ زوجیت ادا کیا۔ تھپّڑ کی گُونج اور مضروب کی چیخ سے واضح تھا کہ یہ محض اخلاقی تھپّڑ نہ تھا۔ یہ ہو چُکا تو مِسز الیاس نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور ایک تمکنت کے ساتھ تنہا ہوٹل سے باہر چل دی۔

حسینانِ بَصرہ کا ذِکر جتنا جمیل ہے، اُتنا ہی طویل ہے، لیکن اس کی تفصیل سے احتراز ہی

مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اِس میں شک نہیں کہ شائبے کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لیے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بَصرے کی با معنی اور رنگین شام تھی، لیکن ظاہر تھا کہ بَصرے کے لذائز ہمارے قوائے عسکری پر بتدریج غالب آرہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا، تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بَصرہ سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دُور نہیں تھا۔

اواخر اکتوبر میں ہمیں اچانک حکم مِلا کہ فی الفور ہیڈ کوارٹر دسویں ڈویژن میں پہنچو۔ یہ جنگ آزما ڈویژن اس وقت حبانیہ میں تھا۔ وہی حبانیہ جہاں مشہور برطانوی ہوائی اڈّہ تھا۔ چنانچہ دُوسرے روز شائبہ اور بَصرہ کو حسرت ناک سی الوداع کہی اور بَصرہ کے اسٹیشن سے بغداد کی گاڑی لی۔ اس سفر میں ہمارے ساتھی لیفٹینٹ سپنس(SPENCE)تھے۔

گاڑی کے ڈبّے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ خلد کا دَر کھُل گیا ہے۔ ڈبّہ کیا تھا ایک رواں دواں دیوانِ خاص تھا۔ نفیس اور نرم صوفے، نازک ریشمی پَردے، ملائم اور گداز قالین۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قلوپطرہ داخل ہو گی اور کہے گی:

"معاف رکھیے، آپ غلطی سے آ گئے ہیں، یہ کمرو میرے لیے ریزرو ہے۔"

ہم نے پیچھے وطن میں بھی پہلی مرتبہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے وقت ذرا عیش سا محسوس کیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وُہ احساس سراسر ناروا تھا اور اب کہ حقیقی عیش سے ہمکنار تھے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو کھو دیا۔

یہ ہو چُکا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ آخر عین جنگ کے زمانے میں کہ غریب عراق کو پاؤں کے لیے جوتے میسّر نہیں، اِن سنہری روپہلی ڈبّوں کی عیاشی کیا معنی؟ اور تفتیش پر یہ معنی نِکلے کہ یہ مُجلّا و مُطلّا ڈبّے حکومتِ ایران کی ملکیت ہیں یا تھے جو حافظ و خیام کے خوش مذاق ہم وطنوں نے جرمنی سے منگوائے تھے کہ سفر کرتے وقت آبِ رکنا باد و گلگشت مصلّے کی کمی محسوس نہ ہو، لیکن گزشتہ اگست کی چند روزہ جنگ میں یہ مالِ غنیمت جرمنی سے آتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور بصرے میں اُتار لیا گیا اور نتیجہ یہ کہ وُہ عیش جو فقط تجمّل حسین خان کے لیے بنا تھا سپنس اور محمّد خان کے حِصّے میں آگیا۔ یہ سفر اگرچہ گھڑیوں میں کٹ گیا، لیکن جو گھڑیاں قلوپطرہ کی آغوش میں کٹیں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غنیمت ہوں گی۔

دوپہر کے قریب ہماری گاڑی بغداد پہنچی۔ ہمیں بتایا گیا کہ باہر ہمارے لیے پندرہ ہنڈرڈ ویٹ کا ایک فوجی ٹرک انتظار کر رہا ہے۔ یہ سُنا تو یوں محسوس ہوا جیسے قلوپطرہ نے آغوش سے نکال کر پلیٹ فارم پر دے مارا ہو۔ بہر حال اِس ٹرک نے ہمیں اور سپنس کو حبانیہ لے جانا تھا۔ (حبانیہ بغداد سے مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے)

سپنس بولے: ”آؤ ذرا حبانیہ جانے سے پہلے بغداد میں تو جھانک لیں۔“ دجلہ کے پُل سے گُزر کر شارع رشید میں داخل ہوئے۔ یہی بغداد کا دِل تھا اور ہے۔ وُہی بصرہ کے سے تیور۔ اگرچہ ذرا زیادہ تیکھے۔ دُخترانِ بغداد سے نگاہ لڑی تو محسوس ہوا کہ مقابلے میں نِگاہ نہیں تیغِ نگاہ ہے۔ بڑا غیر مساوی مُقابلہ تھا۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ کوئی سنگین واردات ظہور پذیر ہوتی ہمارا ٹرک حبانیہ کی شاہراہ پر تھا۔

یہ وُہی سڑک تھی جس پر چند ہفتے پہلے رشید علی کی حامی عراقی فوج کو انگریزوں کے ایک بریگیڈ نے ایک دن میں شکست دی تھی۔ یہ خیال آیا اور دِل میں پھر وُہی کرب کا احساس اُٹھا کہ کاش یہ لوگ جیتتے یا کم از کم کچھ لڑ کر ہارتے۔

حبانیہ کیمپ میں پہنچے جہاں ایک سمندر نُما جھیل کے کنارے دسویں اِنڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر مقیم تھا، یعنی ہماری منزلِ مقصود۔ اُترے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا، لیکن اِس جائزے میں جھیل کے سوا کچھ پلّے نہ پڑا۔ جدھر دیکھو جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لیے کہ زمین پر کھڑے ہیں، سینۂ خاک کو پاؤں سے دبانا پڑتا تھا ورنہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تیر رہے ہیں۔ جھیل کے گہرے نیلے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور بے اختیار اس میں کود پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن اپنے آپ سے مشورہ کیے بغیر۔ اور اِس زخار نمکین جھیل میں کود جانا شاید ایسا صحت بخش ثابت نہ ہوتا؛ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لبِ آب ہی سے جھیل کا تماشہ

کر کے گُزر گئے۔

چند قدم ہی گئے تھے کہ وُہ خیمے آ گئے جو ہمیں قیام کے لیے مِلے تھے۔ یہ پستہ پستہ نابالغ سے خیمے اپنے وزن کے لحاظ سے FORTY POUNDERS یعنی "بیس سیرے" کہلاتے تھے۔ بمشکل ایک آدمی اِن میں رہ سکتا تھا اور آدمی سے مُراد آدمی ہے۔ وُہ حضرات جو بیشتر پیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں، اس خیمے کے لیے آدمی سے ذرا فالتو نکلتے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سب شائبہ کے لنگر خانوں میں رہ گئے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک خیمہ ملا۔ بستر کھولا، ہاتھ مُنہ دھویا۔ یا بقول سپنسں "واش" کیا۔ کپڑے بدلے۔ اگرچہ ایک خاکی جوڑا اُتار کر دُوسرا خاکی جوڑا پہننا کپڑے بدلنے سے مختلف فعل ہے۔ اور حبانیہ کے سینما میں فلم دیکھنے چل دیے۔ جی ہاں! یہاں فلمیں بھی تھیں، یعنی باقی تمام خرافات کے علاوہ اِس لیے کہ یہاں جنگ کا زمانہ تو تھا، صِرف جنگ نہ تھی۔ انگریزوں نے اِس ہوائی مُستقر میں ایک طویل زمانۂ امن گُزارا تھا؛ چنانچہ حبانیہ تفریحات و آسائش کے اعتبار سے برطانیہ کا لخت بلکہ لختِ جگر نظر آتا تھا۔ حبانیہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں اِس بے باکی سے پھر رہی تھیں گویا پِکاڈلی میں گھُوم رہی ہوں۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ جتنا حبانیہ برطانیہ کی نسبت گرم تھا، اتنا ہی اِن دُخترانِ فرنگ کا حُسن لباس کی آلائش سے پاک تھا یعنی ہر چند کہیں کہ تھا، نہیں تھا۔ بقول شخصے

اِس اِشتعال کو برداشت کرنے کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت تھی۔ ہماری پیغمبری کے متعلق[18] Casualty ،وغیرہ تو نہ چھپی، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ اشتعال ہم نے کمال صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں ہمارا قیام مُسافرانہ تھا کہ ایک نیم لفٹین کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ ہماری پکی منزل بریگیڈ تھی۔ چنانچہ صُبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہمیں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ میجر سٹیڈ نے ہمیں ۲۰ بریگیڈ کے سِگنل کے سیشن میں ''سیکنڈ اِن کمانڈ'' ہونے کی نوید دی۔ ساتھ ہی تقرّر کے کاغذات دیے اور دُعا اور پیار کے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔

---

18 فوج میں کسی شخص کی ترقّی، تبادلہ یا انعام کے متعلّق کسی قسم کا تحریری اعلان ہو تو اُسے Casualty چھپانا کہتے ہیں۔

صحرائے کیارہ اور بریگیڈ آفیسرز میس

۲۰ بریگیڈ اُس وقت بغداد کے شمال میں کوئی ڈیڑھ سو میل دُور کیارہ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ ہم نے بغداد پہنچنے پر گاڑی لی۔ رات سفر میں کاٹی اور صُبح سویرے کیارہ کے اسٹیشن پر اُترے جہاں ایک اور اٹل ٹرک ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تک اور سینکڑوں مِیل ارد گرد ایک پسماندہ اور پابرہنہ ساصحرا تھا۔ کیارہ اگر کسی آبادی کا نام تھا، تو وُہ بالائے زمین نہ تھی۔ ہر طرف ویرانہ تھا۔ ظاہر تھا کہ ۲۰ بریگیڈ کے لوگوں کو ان مسائل سے واسطہ نہیں جو حضرت آدم کو باغ عدن میں پیش آئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے سیدھا بریگیڈ کے آفیسرز میس میں پہنچا۔ لفظ میس سے کسی عالیشان عمارت کے تصوّر کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سادا فوجی خیمہ تھا۔ اندر داخل ہوا تو تمام

افسر ناشتے میں مصروف تھے۔ ہمارے رہبر نے پہلے برگیڈ ئیر صاحب سے اور پھر دُوسرے افسروں سے ہمارا تعارف کرایا۔ تعارف ختم ہو چُکا تو جس گفتگو میں ہم مُخل ہوئے تھے، پھر سے جاری ہوئی۔ بریگیڈ کمانڈر صاحب جو ایک معمّر سے بزرگ تھے، ایک نوجوان کپتان سے یوں مخاطب ہوئے:

"پیٹر، تُم بغداد جارہے ہو؟"

"یس سر۔"

"تو پھر دیکھنا، شاید اُس کی کوئی بہن بھی ہو۔"

"بہن تو ہے سَر، مگر"

"مگر کیا؟"

"آپ کو جیفری سے اِجازت لینا پڑے گی۔"

پیٹر نے جیفری کا نام لِیا تو ایک خوش رُو کپتان قریب کی کرسی سے اُٹھا۔ کمر سے جھُک کر برگیڈ ئیر صاحب کو سلام کیا اور بولا:

"سر اِس مُعاملے میں شِرکت نہیں ہوتی۔"

اِس پر ایک قہقہہ پڑا اور خُود بریگیڈئیر صاحب کھِلکھِلا کر ہنس دیے۔

اگر یہ مُختصر سی گفتگو کسی قاری کی سمجھ میں نہ آئے، تو یہ گفتگو کا قصور ہے۔ خُود مُجھ پر اس کے رموز آہستہ آہستہ منکشف ہوئے۔ اور جب منکشف ہو چُکے تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا کہ ایک صحّت مند لیکن بہر حال بُوڑھا بریگیڈئیر اپنے نوجوان ماتحت افسروں سے اِس حد تک بے تکلّفی کی باتیں کر سکتا ہے۔ دِلِ نادان کو طرح طرح کے سوال سُوجھے۔ شرم کیا چیز ہے؟ حیا کیا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وُہ ضبط کیا ہوا جس پر سارا فوجی نظام قائم ہے؟

اِن سوالوں کے جواب بریگیڈ میں چند دِن رہنے کے بعد ہی معلوم ہو گئے۔ جہاں تک ضبط کا تعلّق ہے، یہ میس کی بے ضبطی صِرف درُونِ میس کی بات تھی۔ میس کے باہر وُہی حفظِ مراتب تھا جو فوج میں ہوتا ہے۔ سینئر کا حکم اور جونیر کی لبیک، خواہ تعمیلِ حکم میں جان ہی کیوں نہ جائے، بلکہ یہ کہ میس کی آزادی کی باہمی احترام اور محبّت کی ضامن تھی۔ اچھی فوج کے سپاہیوں میں ایّامِ جنگ میں ایک عجیب ولولہ انگیز دوستی اور جانثاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہزار قالب مگر یک جان اور جہاں ماحول ایسی بے پایاں محبّت کا ہو وہاں مصنوعی ضبط کا رشتہ غیر ضروری اور بے معنی سا ہو جاتا ہے، مگر یہ فقط حوصلہ مند فوجوں کا خاصہ ہے۔ خوف زدہ اور شکست خوردہ فوجوں کا حال کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ افسر چڑچڑے اور اپنے رُعب کی حفاظت میں آستینیں چڑھائے

ہوئے، باہر سے بپھرے ہوئے مگر اندر سے کانپتے ہوئے۔ سپاہی بُزدل اور حریص۔ باہمی رفاقت کا یہ عالم کہ ساتھیوں میں سے کسی کی آنکھ چُوکی، تو حسبِ توفیق اُس کی جیب یا گلا کاٹ لیا۔ ایسی فوجوں میں قیامت کی نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے اور ایسے ماحول میں جان نثاری کی نہیں جاتی، کرائی جاتی ہے۔

رہا شرم و حیا کا مُعاملہ، تو شرم کی وُہ قِسم جو ہمارے ہاں رائج ہے ۲۰ بریگیڈ کے میس تک نہیں پہنچی تھی اور اس کے لیے وُہ لوگ کچھ معذرت خواہ بھی نہ تھے۔ ایک تو انگریز کا حیا کا تصوّر ہی ہماری دیسی حیا سے بہت مختلف ہے، پھر جنگ کا زمانہ ہو اور کیارہ جیسا ویرانہ، جہاں شش جہات میں مرد ہی مرد تھے اور کوسوں تک کسی نِسوانی گوش کے بر آواز ہونے کا امکان نہ تھا، تو وہاں حیا ایک بیکار بلکہ گراں بار تکلّف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ غالب کا دِلّی میں بیٹھے بیٹھے وضعِ احتیاط سے دَم رُکنے لگتا تھا تو صحرا نشینانِ کیارہ کے لیے تو پاسِ حیا یقیناً دمے کا باعث بنتا۔ تھوڑی سی چاک گریبانی سے حیا کا تو کچھ ایسا نہ بگڑتا تھا، لیکن اِن قوم کے سرفروشوں کی صحّت بنی رہتی تھی۔

یہ شاید انہی روایات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فوجی افسروں کا اندازِ گُفتار غیر فوجی حضرات کے لیے عرق آور ثابت ہوتا ہے اور ان کے الفاظ کا انتخاب بعض نازک طبع سویلین بھائیوں کو اس شدّت سے مردانہ محسوس ہوتا ہے کہ وُہ بات سُننے کی بجائے اپنی عصمت بچانا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فوجیوں کا یہ طرزِ کلام ایک

خاص قسم کی مردانہ محفلوں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کی موجودگی میں اُن کا اندازِ تکلّم یکسر بدل جاتا ہے۔ یہ فوجی روایات کا حِصّہ ہے کہ جہاں خواتین موجود ہوں تو یہ اکھڑ لوگ بے حد ریشمی اور ملائم گفتگو کرتے ہیں۔ اوّل تو کسی کثیف موضوع کو چھیڑنا ہی خلافِ شجاعت سمجھتے ہیں، لیکن اگر کسی مقام پر بادہ و ساغر کے بغیر نہ بنے تو انہیں یہ کہنا بھی آتا ہے۔ یہ احتیاط ہمارے عوام میں کسی قدر کمیاب ہے۔ عام مجالس میں لوگ خواتین کے سامنے ایسے کلمات کا استعمال روا سمجھتے ہیں جو خاصے ناروا ہوتے ہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ ہماری خطا پوش خواتین انہیں حافظِ قرآن نہ سمجھتے ہوئے بھی چھوڑ دیتی ہیں۔

ناشتے کی میز پر ہمارے سوا تمام انگریز تھے۔ اگرچہ تمام افسروں نے مع بریگیڈیر صاحب کے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا؛ تاہم واحد دیسی ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ خیمے کے دروازے سے ایک دیسی کپتان میس میں داخل ہوتا ہے۔ سانولا سا رنگ، باریک تیر نما سی مُونچھ، بال بال قرینے سے کٹا ہوا، ایک ہاتھ میں پائپ اور دُوسرے میں اخبار۔ اپنے ہم وطن کو دیکھا، تو میری آنکھوں میں جیسے روشنی سی لہرائی اور اِنتظار میں تھا کہ میری طرف دیکھے تو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالوں کہ خُوب گُزرے گی ۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے کپتان صاحب کی نِگاہ مُجھ پر ٹکنے ہی نہ پائی اور ایک دفعہ ذرا سی

پڑی بھی، تو اُنہوں نے جیسے کھینچ کر واپس لے لی۔ کچھ حیرانی سی ہوئی کہ

ہم ہیں مُشتاق اور وُہ بیزار

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کپتان صاحب ناشتے کے لیے بیٹھ گئے اور برگیڈ ئیر صاحب نے ہمارا اُن سے تعارف کرایا۔ لیکن کپتان صاحب نے فقط ایک لمحے کے لِیے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹائی، بلکہ توجہ کو غالباً وہیں رکھّا صرف اپنی ٹھوڑی گھمائی اور ایک جمائی میں لپٹی ہوئیHow Do You Do[۱۹] کہہ کر ٹھوڑی اُلٹے رُخ گھُما کر اُسی زاویے پر لے گئے جہاں پہلے تھی۔ معاً مجُھے وُہ شیر یاد آیا جو میٹرو گولڈوِن مئیر کی فِلموں کے شروع میں ٹھوڑی کو پچھلی طرف موڑ کر ہلکی سی احتجاجی انگڑائی لیتا ہے اور پھر سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی واقعہ کا اثر ہے کہ میں آج کل بھی جب یہ شیر فِلم میں دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے اسے بھی کوئی برگیڈ ئیر تعارف پر مجبُور کر رہا ہے۔

تو فرض کر لیں کہ اِن حضرت کا نام کیپٹن مہتہ تھا۔ اب مہتہ صاحب کو حق تھا کہ طبیعت

---

۱۹ تعارف کے موقع پر انگریزوں کا رسمی جُملہ: مزاج اچھّے ہیں؟

کے اکھڑّ ہوں، مزاج کے سنکی ہوں اور گُفتار کے سڑیل ہوں۔ غرض ہر پہلو سے بد تمیز ہوں، لیکن بد تمیزی میں مساوات برتیں۔ لیکن ہوا یہ کہ مہتہ صاحب نے مُجھ سے تو مقاطعہ کر لیا، مگر انگریزوں کے آگے دوہرے ہو ہو کر بچھنے لگے۔ کسی سے گُڈ مارننگ، کسی سے ہیلو۔ خالص انگریزی انداز مگر ذرا کم خالص انگریزی زبان میں ہر ایک سے خیریتِ مزاج پُوچھی اور انگریزوں کی عادت کے مطابق مزاج پُرسی کے علاوہ خواب پُرسی بھی کی۔ یعنی رات نیند تو اچھّی آئی تھی، پھر برگیڈیئر صاحب کو مخاطب کر کے موسم پر تبصرہ کیا۔ کیونکہ ایسا نہ کیا جاتا تو آپ کی انگریزیت ابھی خام تھی۔۔۔ وُہ لوگ تو کپتان صاحب کو جانتے ہی تھے، ظاہر تھا کہ آج ان کی صاحب بہادری کی نمائش میرے استفادے کے لیے ہے اور وُہ مُجھے سبق دے رہے تھے کہ زنہار ہمیں اپنے جیسا NATIVE نہ سمجھیو۔ تم دیسی ہو تو ہو، ہم صاحب ہیں۔

اَب اس خاکسار کو مرعوب ہونے میں بھی عُذر نہ تھا، لیکن کچھ مُہلت چاہتا تھا کہ مہتہ صاحب کا اقتدارِ اعلیٰ قبول کرنے سے پہلے ذرا انہیں تفصیل سے دیکھ تو لیں اور تفصیل میں گئے تو ہمیں مہتہ صاحب سے گہری ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ بات یہ تھی کہ کیپٹن مہتہ صاحب حقیقتاً صاحب بہادر نہ تھے۔ فقط صاحب بہادری کے مریض تھے۔ اُن سے اُلجھنا بیکار تھا، بلکہ اُن کی تیمارداری کے سلسلے میں ان کی باجگزاری بھی قبول کر لی، لیکن وُہ اپنی دیرینہ بیماری سے شفایاب نہ ہو سکے اور ہمارا دیسی پن معاف نہ کیا۔ سال بھر میں

ہم سے دو چار ہی باتیں کیں اور وُہ بھی پائپ سے چھنی ہوئی انگریزی میں۔

لیکن بریگیڈ میں کیپٹن مہتہ کے علاوہ اور لوگ بھی تھے اور خوش قسمتی سے مزاج کے لحاظ سے بالکل غیر مہتہ۔ مثلاً میرے اپنے سِگنل سیکشن کے کیپٹن مینسفیلڈ ایک متفنّی مگر دلفریب شخصیت کے مالک تھے۔ سالہا سال سارجنٹ رہنے کے بعد آخری عُمر میں افسر بن گئے تھے۔ لیکن جیسے عِشقِ بُتاں میں عُمر گزارنے کے بعد مُسلمانی کے انداز نہیں آتے، کپتان صاحب کی شکل و صُورت یا حرکات و سکنات سے بھی افسرانہ آثار ناپید تھے۔ وہی سارجنٹوں کا درندہ نما چہرہ اور چہرے سے درندہ تر زبان۔ آپ کی ہر بات پھکڑ کی شکل میں مُنہ سے نکلتی۔ ذرا مزے میں آ کر باتیں کرتے تو کہرام مچ جاتا۔ پاکیزہ سے پاکیزہ مضمون بھی گالی کا سہارا لیے بغیر ادا نہ کر سکتے؛ البتّہ گالیاں اِس قدر بلیغ کہ کوئی کھا کے بے مزا نہ ہو۔ یوں بھی انگریز گالیاں ہماری گالیوں کی طرح لبادہ اوڑھے بغیر وارد نہیں ہوتی بلکہ خاصی ملبوس اور ملفوف ہوتی ہیں۔ کپتان صاحب کی طبیعت میں تصنّع نہ تھا۔ سیدھا سادا انسان اور دوستوں پر شیدا۔ مُجھے قُربِ خاص حاصِل تھا کہ وُہ کمانڈر تھے اور میں اُن کا نائب۔ زندگی ایک مسلسل ہنسی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کام نہیں کر رہا، بلکہ لگاتار مزاحیہ فلم دیکھ رہا ہوں۔ دو انگریزی الفاظ جنھیں انگریز شرفاء بولنا تو کجا سُن کر بھی بِدک جاتے ہیں، اُن کی زبان سے تفریحاً جھڑتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا:

”اگر یہ دونوں الفاظ آپ سے چھین لیے جائیں تو؟“

بولے: ”بس گونگا ہو جاؤں گا اور کیا؟“

لیکن اُن کا انگریزی فقرہ اِتنا سادہ نہ تھا۔

“God Al ….. Mighty, I will be …. dumb!”

خالی جگہوں میں جڑاؤ کا بے نظیر کام تھا لیکن اس کاریگری کی اُردو میں نمائش مُشکل ہے۔ میرے پہنچنے کے بعد ہی کیپٹن منسفیلڈ کا تبادلہ ہو گیا اور اُن کی جگہ کیپٹن شاء(SHAW) آ گئے۔ نارمن شاء کیا آئے، کیارہ کے ویرانے میں پھُول کھِل اُٹھے۔ کیا خوش وضع و خوش اوقات اِنسان تھا۔ پہلی سی مُلاقات میں دوست بن گیا اور ہمیں دوست بنا لیا۔ میرا سینئر تھا۔ لیکن یہ اس لیے کہ کاغذوں میں درج تھا۔ کیپٹن شاء نے مُجھے اِس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہمارے جوان شاء پر جان دیتے تھے اور وُہ اُسی محبّت کے قابل تھا۔

بریگیڈ کے دیگر افسروں کے ساتھ ہمیں ذرا کم واسطہ تھا لیکن رہتے ایک ہی میس میں تھے۔ گویا ایک ہی کنبہ تھا۔ دن میں کئی بار اکٹھے ہوتے اور راتیں تو اکثر میس میں ہی سحر کر دیئے۔ ولسن، جیفری، ٹرن بل، سپونر، مارگن، سٹمسن، مچِسن، ہرلی، شاء اور

ہمارے بریگیڈ کمانڈر، رابرٹس (جو بعد میں سر اوگلوی رابرٹس بنے) اِس میس کے ارکان تھے۔ طبیعتیں سب کی جدا جدا، لیکن اپنی جگہ پر ایک ہیرو۔

اِن میں سے ایک کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ تھے کیپٹن ہرلی۔ بریگیڈ میں واحد اینگلو انڈین تھے اور مُجھ سے چند روز بعد آئے تھے، لیکن چُونکہ پُورے انگریز نہ تھے، کیپٹن مہتہ نے اُن کے آنے سے کئی دن پہلے ان کے جرائم کے اعداد و شمار اور بد اعمالیوں کی فہرست شائع کر دی تھی، بلکہ ضمیمے کے طور پر جملہ افسروں کو فرداً فرداً بھی تبلیغ کرتے رہتے تھے کہ ہرلی آمد بریگیڈ کے لیے کس قدر مُضرِ صحّت ثابت ہو گی۔

ایک اینگلو اِنڈین کو بدنام کرنا نسبتاً آسان ہے کہ ایک تاریخی حادثے کی وجہ سے اِن لوگوں کے خلاف یوں بھی دھیمی دھیمی نفرت ہر دِل میں سُلگتی رہتی ہے۔ لہٰذا کسی اینگلو انڈین کو مکمّل طور پر نذرِ آتش کرنے کے لیے فقط ملائم سی بی جمالو کی ضرورت ہوتی ہے اور مہتہ صاحب تو گویا کیپٹن جمالو تھے۔ بیچارہ ہرلی بریگیڈ میں پہنچا، تو لوگوں نے ناک پر رُومال رکھ لیے لیکن ہرلی اِس بدتمیزی سے ذرا برہم نہ ہوا اور اپنی گُفتار و کردار سے ایسی دِلکش شخصیت کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے دِلوں کو سچ مُچ موہ لیا۔ مہتہ صاحب اسے اپنی شکست سمجھے۔ اِتفاق سے برگیڈ ئیر صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے اور ابھی ہرلی سے مِل نہ پائے تھے کہ مہتہ اِن کی خِدمت میں جا پہنچا اور اُنہیں فی الفور فتنۂ ہرلی سے آگاہ کرنے لگا۔ برگیڈ ئیر صاحب نے پُوچھا:

”ہرلی میں کیا خرابی ہے؟“

مہتہ بولے:”بے شمار خرابیاں ہیں۔“

”مثلاً؟“

”جوا کھیلتا ہے؟“

”اور؟“

”شراب پیتا ہے اور!!“

”عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے!!!“

برگیڈیئر صاحب بولے:”بڑا خوش مذاق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جائیں اُسے کہیں، آج شام چائے میرے ساتھ پیے۔“

یہ سُن کر مہتہ کو سخت مایوسی ہوئی۔ بولا:

”سَر آپ کچھ بھی کہیں، میری چھٹّی حِس کہتی ہے کہ ہرلی اچھّا آدمی نہیں ہے۔“

برگیڈیئر صاحب زور سے ہنسے اور بولے:

”مہتہ، تمہاری چھٹّی حِس تو بہت تیز ہے مگر معلُوم ہوتا ہے تمہاری باقی پانچ حِسّیں خاصی سُست ہیں۔ دیکھتے نہیں یا کم از کم سُونگھنے نہیں کہ ہرلی کس قدر زندہ دِل آدمی ہے؟ جاؤ تم بھی ایک چھوٹا وہسکی پی لو۔“

گیارہ میں فوجی طور پر بہت کچھ کرنے کو تھا۔ مورچے اور خندقیں کھودنا، فوجی مشقیں کرنا وغیرہ۔۔۔ اور بہت کچھ کیا جاتا تھا، لیکن وہاں کی زندگی کا محور میس تھا۔ وہی نیم زمین دوز خیمہ جس میں چُوں چُوں کرتی سفری میزیں اور کینوس کی کرسیاں رکھی تھیں کہ اگر کسی وجہ سے بریگیڈ کو اچانک دُکان بڑھانا پڑے، تو خانہ بدوشی وبالِ دوش نہ ہو جائے اور یہ خانہ بدوشی ایسی غیر اغلب بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے شمال میں بلخ بخارے کے نواح میں ہٹلر کی آمد آمد تھی اور وُہ کسی وقت دیوار کی دُوسری طرف کھڑے ہو کر ہم سے تُوتُو مَیں مَیں کر سکتا تھا۔ لیکن بظاہر کچھ دِنوں کے لیے ہمارا قیام یقینی تھا اور ہمارا میس ہر چند کہ چھجو کا چوبارہ تھا تاہم ہمیں یہاں وُہ آرام میسّر تھا جو بلخ بخارے میں تو اَب یقیناً نایاب تھا۔

زمانۂ امن میں فوجی مَیسوں میں میزیں، کرسیاں، چھُریاں، چمچے جگمگ جگمگ کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی چمچہ یا کانٹا جگمگانے میں مزاحمت کرتا، تو افسر لوگ اسے ہتک افسری سمجھتے تھے اور بیَروں، خانساموں کی جان پر بَن آتی تھی، لیکن ہمارے جنگی میس کا سامان شاید جگ تو کرتا ہو، لیکن ہم نے اُسے مگ کرتے کبھی نہ دیکھا اور نہ ہی اس کی

ضرورت محسوس کی۔ ہم نے ان گرد آلود کرسیوں میں سکون کے وُہ لمحے دیکھے جو فرنگی صوفوں کی آغوش میں بھی میسّر نہ آسکے اور جب دِن بھر کی فوجی مشقوں سے چُور ہو کر شام کو میس کی کرسیوں میں آ بیٹھتے، تو معلوم ہوتا کہ سلمیٰ نے اپنی گداز بانہوں میں لے لیا ہے۔

ایّامِ جنگ میں آپ نے اپنے گھروں میں سامانِ خورد و نوش کی کمی محسوس کی ہو گی وُہ ہونا چاہیے تھی، کیونکہ اُس کی پیشی ہمارے جنگی مَیسوں اور لنگروں میں پڑی تھی۔ ہمیں انگریزوں سے لاکھ شِکوے سہی لیکن وافر اور متنوّع خوراک کی شکل میں جو جوابِ شکوہ انگریزوں نے ہمیں دیا اُسے کوئی سپاہی نہیں بھُول سکتا۔ پھر شاید انگریز رزق رسانوں کی دیکھا دیکھی قادرِ مطلق بھی ہم پر مہربان تھا اور ہمارے گرد و پیش فراواں شِکار بکھیر رکھّا تھا۔ عراق بیشتر صحرا ہے جہاں کھانے کو بظاہر کچھ نہیں لیکن جتنے پرندے اور غزال عراق کے صحرا میں ہیں، کسی دُوسری جگہ نہ ہوں گے۔ ہم سوچتے تھے کہ اِن میں عقل ہو تو عراق چھوڑ کر ہمارے ہاں چھانگے مانگے میں کیوں نہ چلے جائیں، جہاں آب کی کمی ہے نہ دانے کی، لیکن صحرا نوردوں نے کبھی ناصحوں کی بات پر کان دھرا تھا جو یہ دھرتے۔ شکار کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بندوق اُٹھا کر فقط کیمپ سے باہر نکلنے کی تکلیف کرنا پڑتی تھی۔ اِس کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ امیر خسرو کہیں سے آواز دے رہے ہیں۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
اُمید آں کہ روزے بہ شکار خوہی آم

شکار کا انداز یہ تھا کہ آپ جیپ میں بندوقیں تانے بیٹھے ہیں کہ بیسیوں آہو سر بکف سامنے آتے ہیں۔ آپ جیپ میں بیٹھے ہی مشقِ ناز فرماتے ہیں اور وُہ پیکرِ وفا کے بعد دیگر خونِ دو عالم اپنی گردن پر لیتے آپ کی جیپ کے ٹائروں میں ڈھیر ہوتے جاتے ہیں اور آپ کے اردلی اُٹھا اُٹھا کر دُوسری جیپ میں اِن کشتوں کے پُشتے لگا دیتے ہیں، ذرا آگے چل کر آپ دَجلہ کے کنارے آ نکلتے ہیں، تو ہزاروں تیتر اور چکور آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک ایک کر کے اِس لیے نہیں بیٹھتے کہ انہیں معلوم ہے آپ اناڑی ہیں اور ان بامروّت پرندوں کو گوارا نہیں کہ آپ کا نشانہ خطا جائے۔

نتیجہ یہ کہ میس کے خیمے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کی میز پر غزالوں اور چکوروں کے روسٹ کا ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ اگرچہ میس سے نکلتے وقت یہ بُلندی خاصی ہموار ہو جاتی تھی اور کیارہ کی سردی کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا سوائے اس آتشِ سیال کے جس کے خُم براہِ راست سکاٹ لینڈ سے کیارہ کے ویرانے میں لائے اور لنڈھائے جاتے تھے۔

بریگیڈ کے افسروں میں صِرف مَیں ہی مُسلمان تھا اور جب کبھی وہسکی کا گلاس لینے سے

اِنکار کرتا، میرے مَے نوش ساتھی ایک گہری ہمدردی کے عالم میں میری محرومیٔ قِسمت پر آہیں بھرنے لگتے۔ ایسی آہیں جو معلوم ہوتا تھا آسمان چیر کر نِکل جائیں گی۔ جب ان صاف باطن رِندوں کا کرب مُجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک روز جامِ وہسکی تھام ہی لیا۔ اس پر اِن سَر مستوں نے اپنی شادمانی کے اظہار کے لیے میرے گِرد اس قدر دیوانہ وار رقص کیا گویا فلک جھُوم رہا ہو۔

ہمارے میس میں پینے کے لیے پانی کا استعمال اگر ناجائز نہ تھا تو مکروہ ضرور تھا۔

ایک دوپہر کو کیپٹن وِلسن باہر سے تھکا ہوا آیا، تو بیرا پھُرتی سے ایک تازہ پانی کا گلاس بھر لایا اور صاحب کو پیش کیا۔ وِلسن نے پانی دیکھا تو ایک وحشت کے عالم میں چلّایا۔

”بندۂ خُدا مُجھے کچھ پینے کو دو۔ مَیں وضو کرنے نہیں آیا۔“

میس سے باہر ہماری گُفتار اور حرکات پر ہٹلر، توپ اور تفنگ چھائے ہوئے تھے، لیکن میس کے اندر اِن چیزوں کا گُزر نہ تھا۔ وہاں موضوعِ گُفتگُو فقط ایک تھا: عورت [۲۰] اور کس باریکی اور بے باکی سے اِس موضوع کو کریدا جاتا تھا۔ پہلے

---

۲۰ یاد رہے کہ یہ ایک طرح کی جنگی رعایت تھی، ورنہ امن کے زمانے میں میس کے میز پر عورت کا ذکر فوجی آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

دن یہ گفتگو سُنی تو محسوس ہوا کہ چند دن اور اِسی معصیت کی زندگی کے گُزارے تو ہم پر بہشت کے دروازے بند ہو جائیں گے لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسے عادی ہو گئے کہ نہ صرف احساسِ گناہ جاتا رہا، بلکہ یہ احساس بھی ہونے لگا کہ ابھی تو مَیں جوان ہوں۔ پھر زلفِ یار کی باتیں فقط تحت اللّفظ ہی نہ ہوتیں، بلکہ نہایت مرصع انگریزی گانوں میں بھی۔ انگریز نہایت دیانتداری سے انہیں DIRTY SONGS (گندے گانے) کہتے ہیں اور غیر مطبوعہ انگریزی لٹریچر میں جتنا ذخیرہ اس صِنفِ سُخن کا ہے وُہ پاکیزہ گانوں کا نہیں۔ پھر انگریز بلکہ تمام یورپی اقوام کورس میں گانے کی عادی ہیں اور جس طرح کورس کی گُونج مطالبِ سُخن کو جلا دیتی ہے اور گانے والے کے دِل و دماغ کو گرماتی ہے وُہ سولو یا اکیلے گانے میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو لوگ ان دِنوں عراق میں تھے انہیں ایک کورس یاد ہو گا جس کی آواز اکثر افسروں کے مَیسوں سے سنائی دیتی تھی۔ THERE IS SHORTAGE OF GOOD WOMEN IN ERBIEL[21]

21 لفظی ترجمہ: "اربیل میں اچھّی عورتوں کا توڑا ہے"۔ اربیل عراق کا ایک شہر ہے۔

ہماری تہذیب میں کورَس کے جملہ حقوق کم و بیش قوّالی کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مَیسوں کا ہلکا پھُلکا ماحول قوّالی کی طہارت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ جنگ کے آخری سالوں میں جب دیسی افسروں کی تعداد بڑھنے لگی تو ہم نے بھی محض انگریزوں کو جواب دینے کی خاطر چند نیم دیسی گانوں کورَس کی شکل میں مَیسوں میں پیش کیا۔ مثلاً "شہر کی لونڈیا" اور "چھیّٔ" وغیرہ۔ لیکن وُہ بات پیدا نہ ہو سکی جو انگریزی کورَس کا خاصہ ہے۔ بریگیڈ میس میں نئے نئے پہنچے اور انگریز افسروں کو باہم باتیں کرتے سُنا تو ہمیں اچانک احساس ہوا کہ ہم تو انگریزی میں کورے ہیں۔ ہمیں بھرتی ہونے سے پہلے ناز تھا کہ ہم نے شیلے اور مِلٹن پڑھ رکھا ہے اور یہ کہ اور نہیں تو ہم TABLE TALK میں نمبر لیں گے۔ لیکن میز پر بیٹھے تو ہماری ساری ٹاک ہوا ہو گئی۔ اِن لوگوں سے بات کرنے یا سمجھنے میں شیلے والی یا مِلٹن فہمی کا کچھ استعمال ہی نہ تھا۔ بے تکلّفانہ مردانہ محفلوں میں انگریزوں کی بول چال چَٹ پٹے محاوروں اور خستہ اور کرارے بلکہ فحش اور عُریاں الفاظ سے مرکب ہوتی ہے۔ اِن الفاظ پر درسی کتابوں اور ڈکشنریوں کے دروازے بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی ہمارے اُستادوں اور سکولوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ فقط اہلِ زبان کے آگے گوشِ ادب وا کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ ہر شب جب ہم میس سے اپنے خیمے کو لوٹتے تو دو صفحے نئے الفاظ کے رقم کر لیتے اور اگلے روز ذرا سہمے سہمے ان کے اِستعمال پر بھی طبع آزمائی کرتے۔ اس فن

میں پختگی کے لیے بڑی ریاضت درکار ہے۔ بہر حال ہمیں اپنی لُغّت پر مکمل عُبور تو نہ حاصل ہو سکا، لیکن گزارا اچھّا خاصا ہونے لگا۔ اَب کہ انگریز جا چُکا ہے، یہ الفاظ کمی اِستعمال کی وجہ سے زنگ آلود ہو گئے ہیں اور جب تک کسی سے لڑائی نہ ہو، زبان پر نہیں آتے۔

کیارہ کے بریگیڈ میس کی روداد نپولین اور بُوجم کے ذکر کے بغیر مکمّل نہ ہو گی۔ نپولین ہمارے میس کا ہیڈ ویٹر تھا۔ یہ ایک عراقی عیسائی تھا۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن قد و قامت اور شکل کے اعتبار سے بالکل نپولین لگتا تھا۔ کبھی کبھی وُہ کشتی نُما ٹوپی بھی پہن لیتا، تو ہمیں شک ہونے لگتا کہ کہیں سینٹ ہیلنا تو نہیں پہنچ گئے۔ اِسی وجہ سے کسی خوش مذاق افسر نے اُسے نپولین کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن اب وُہ سچ مُچ نپولین ہی بن بیٹھا تھا اور اصلی نپولین کے متعلّق کہا کرتا تھا کہ ہاں، اِس نام کا ایک اور شخص بھی گُزرا ہے۔ اگر کبھی پونا پارٹ کہہ کر بُلاتے تو وہ اور زیادہ اطمینان محسوس کرتا اور ذرا اجنبیت نہ دکھاتا کہ اِس طرح فرانسیسی خاندان سے رشتہ اور پکّا ہو جاتا تھا۔

خورد و نوش کی دُنیا میں کوئی معرکہ ایسا نہ ہو گا جسے ہمارے نپولین نے محض اشارے سے سر نہ کیا ہو۔ اپنے ماتحت بیَروں پر خالص جنگی انداز میں کمان کرتا، لیکن آخر اسے بھی ایک دن اپنے واٹر لو کا سامنا کرنا پڑا اور وُہ بھی ایک بے زبان بلکہ بے جان سے مدراسی کے ہاتھوں۔۔۔۔ یہ غریب مَسالچی بھرتی ہوا تھا اور قسمت اُسے مدراس کے

کسی دور افتادہ گاؤں سے سیدھی ہمارے بریگیڈ میس میں لے آئی تھی۔ اس کا اپنا نام تو کچھ انگم منگم ہی تھا لیکن اُسے بُوجم کہہ کر پُکارتے تھے جو ایک فِلم میں گونگے کردار کا نام تھا۔ ویسے بُوجم گونگا نہ تھا۔ فقط ضبطِ نفس کا قائل تھا۔ یعنی بول سکتا تھا، لیکن بولتا نہ تھا۔ وُہ ہر سوال کا جواب ایک شرمیلی مُسکراہٹ سے دیتا تھا۔ اور نپولین کو یہ توقع تھی کہ اُس کے اشارے پر گورنر جھک جائیں اور میز پر پلیٹیں چُننے لگیں۔ بھلا مُسکراہٹ سے اُس کی کیا تسکین ہوتی؟

ایک رات جب بُوجم کی مُسکراہٹ سے پلیٹوں میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی اور ڈنر لیٹ ہونے لگا تو نپولین کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ وُہ بپھرا، گرجا اور برسا یعنی آناً فاناً بُوجم سے گُتھم گُتھا ہو گیا اور اُسے آنِ واحد میں پیوندِ خاک کر ڈالا۔ نپولین مُنہ پر جھاگ لاتا اُٹھا، تو تھوڑی دیر بعد بُوجم بھی اپنی ہڈیوں کو ٹٹولتا اور جوڑتا، دِل و جگر کو تھامتا، کرسیوں کا سہارا لیتا اُٹھ کھڑا ہوا اور اُٹھتے ہی نپولین کو ایسی دلگداز مُسکراہٹ پیش کی کہ اس فاتحِ اعظم کا پِتّہ پانی ہو گیا اور اُس نے غیر مشروط طور پر بُوجم کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، بلکہ بُوجم کو سینے سے لگایا اور اُسے ایک پیار بھرا نام دیا۔ ”گرموشہ“ (خُدا جانے اِس کے کیا معنی تھے یا ہیں) اس پر بُوجم نے ایک اور واضح تبسّم کیا۔ اِس کے بعد بُوجم کا واحد کام میس کے ایک کونے میں کھڑا ہو کر مُسکرانا تھا۔ بریگیڈ کمانڈر صاحب کا کہنا تھا کہ بریگیڈ افسروں کے مورال کی تعمیر میں بُوجم کی مُسکراہٹوں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

ہمارے بریگیڈ کا سِگنل سیکشن جس کا کیپٹن شاء کمانڈر تھا اور مَیں نائب کمانڈر، تمام تر سکھوں پر مشتمل تھا اور اِس کا کام بریگیڈ کے نظامِ مواصلات کو قائم رکھنا تھا۔ یہ کسی قدر فخر سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سِکھ جوانوں نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا؛ البتّہ اُس شب کی قسم نہیں دی جا سکتی جب رَم (RUM[22]) تقسیم ہوتی تھی۔ اُس رات سلسلۂ مواصلات درہم برہم تو کیا سِرے سے ہوتا ہی نہ تھا۔ ٹیلیفون خاموش! وائرلیس مُہر بلب!! اور ایکسچینج انگشت بدنداں۔ رَم نوشی کے بعد ہمارے سِکھ جوانوں کو اِن فرنگی کھلونوں سے کھیلنے کا دماغ نہ رہتا تھا۔ اُن کا قرارِ جان تو اس ڈھولک اور چمٹے کی آواز میں ہوتا جس کی تال پر وُہ جھومتے، ناچتے اور پھر دفعتہً ایک ہنگامہ خیز سی آواز اُٹھتی جو سارے کیمپ کو محیط کر لیتی۔

”تیرے لونگ دا پیا لشکارا نے ہالیاں نے ہل چک لئے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔او بلّے بلّے۔ بلّے بلّے۔ بلّے۔“

اور لمحہ بھر کے لیے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم صحرائے کیارہ میں نہیں ماجھے میں بیٹھے

---

22 شراب کی ایک قسم

ہیں۔

فوج میں ہر افسر کی خدمت کے لیے ایک پانی مقرّر ہوتا ہے۔ جسے بیٹ مین (BATMAN) کہتے ہیں۔ ہمیں سِگنل مین ہر بنس سے ملا۔ پہلی نگاہ پر لباس کے لحاظ سے کچھ ڈھیلا سا نظر آیا۔ دو چار دن کام کر چُکا تو پتہ چلا کہ آپ کے دماغ کے کل پُرزے بھی کچھ ایسے کسے ہوئے نہیں۔ غالباً ہماری خدمت کے لیے اسی وجہ سے چُنے گئے تھے کہ کسی فوجی اِستعمال کے قائل نہ تھے۔ ہر بنس سِنگھ کی خدمات سے صرف تین دن ہی استفادہ کیا تھا کہ ایک شام آہ و بکا کرتا تیز تیز میرے پاس آیا اور گرم آنسوؤں اور سرد آہوں کے درمیان میرے سامنے ایک تار رکھ دیا۔ مضمون تھا:

YOUR FATHER HOPELESS COME SOON

مُجھے تو اِس دیسی انگریزی کا مطلب سمجھ آ گیا یعنی ''تمہارے باپ کی حالت نازک ہے۔ جلد پہنچو۔'' لیکن ایک انگریز کی نگاہ میں یہ بنتا تھا کہ ''تمہارا باپ بالکل بیکار ہے، جلد پہنچو۔'' مَیں ہر بنس سِنگھ کو لے کر کیپٹن شاہ کے پاس گیا۔ کیپٹن شاہ نے تار پڑھا، تو سفید کاغذ پر جواب لکھ کر میرے حوالے کیا کہ اس کے باپ کو بھیج دو۔ جواب یہ تھا:

YOUR SON EQUALLY HOPELESS NOT

COMING

”تمہارا بیٹا بھی اِتنا ہی بیکار ہے۔ نہیں آ سکتا۔“

نیم لفٹین بغداد میں

اگر فرمودۂ اقبال درست ہے کہ "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" تو یقیناً کیارہ کی کائنات سے بے رنگ تر کوئی جگہ نہ ہو گی۔ کیونکہ وہاں سے نزدیک ترین زن کا محلِ وقوع کوئی سو میل کے فاصلے پر تھا، یعنی بغداد میں۔ درمیان میں سر بسر ایک خالص مردانہ صحرا تھا؛ لہٰذا اگر ہمارے بریگیڈ کے افسر اپنے دِل کی سپاٹ خاکی دُنیا میں تھوڑا سا رنگ بھرنے کے لیے بغداد کی ڈیوٹی کے بہانے ڈھونڈتے یا ایجاد کرتے تو سراسر قابلِ معافی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد جانے کے لیے کوئی کارگر بہانہ تلاش کرنا جوئے شِیر لانا تھا اور اگر یہ جوئے شِیر از خود بہنے لگتی یعنی بغداد جانے کے لیے کوئی جائز سرکاری کام نِکل آتا تو بیسیوں رضاکار خدمت کے لیے پیش ہو جاتے۔ خدمت تو ہم بھی پیش کرتے لیکن صرف اکیسویں رضاکار ہی تصوّر ہوتے۔ کیونکہ سب سے جونئیر اور ناتجربہ کار ہونے کی حیثیت سے بریگیڈ افسروں میں ہمیں برادرِ خرد ہی سمجھا

جاتا تھا اور برادرِ خرد کے لیے ایرانیوں نے ایک محاورہ وضع کر کے غریب کا ہمیشہ کے لیے ستیاناس کر دیا ہے؛ چنانچہ بغداد جانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو ہر طرف سے آوازیں اُٹھیں:

”تمیز سیکھو چھوٹے میاں! اِس عمر میں تمہارے لیے بغداد کی سیر موزوں نہیں ہے۔“

ایک دفعہ کسی قدر بے حیائی سے کہہ بھی دیا کہ نہ صرف موزوں بلکہ سخت ضروری ہے، لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ اب کون تاریخِ پیدائش نکلوا کر ثابت کرتا پرتا کہ ہماری شِیر خوارگی کا زمانہ گُزرے مدّتیں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک عرصے تک اپنے پہلو میں دردِ دِل دبائے بیٹھا کیے تا آنکہ ایک روز خُود قدرت کو ہماری خاطر ایک ترکیب سُوجھی۔

ہوا یہ کہ ہمارے برگیڈیئر صاحب کو عربی سیکھنے کا شوق چرایا اور فی الفور ایک عراقی ٹیوٹر منگایا گیا۔ ٹیوٹر نے اپنے گذشتہ تجربے کی بنا پر برگیڈیئر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر عربی سیکھنے میں آپ کا ایک اور ساتھی بھی ہو تو دونوں شاگردوں کا بھلا ہو گا۔ برگیڈیئر صاحب کے ہم جماعت ہونے کا قُرعہ ہمارے نام پڑا۔ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے لیے ایک برگیڈیئر کا ہم سبق ہونے سے بڑی کوفت کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن برخوردار جو تھے، دھر لئے گئے۔

خیر، اب تعلیم شروع ہوئی، تو برگیڈیئر صاحب بڑے مُفید ہم جماعت نِکلے۔ معلوم ہوا

کہ پانچ چھ یورپی زبانیں جانتے ہیں، بلکہ زبانیں سیکھنے کا انہیں چسکا ہے۔ آپ ایران کے مختصر سے قیام سے تھوڑی سی فارسی بھی چُن لائے تھے، لیکن عربی بول چال میں ابھی منقارِ زیرِ پر ہی تھے۔ اور ہم نے کالج میں صرف فارسی پڑھی تھی۔ عربی گو درساً نہیں پڑھی تھی تاہم باقی مُسلمانوں کی طرح (یعنی ٹیڈی مُسلمانوں کو چھوڑ کر) عربی پڑھنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور عربی لِکھنا ہمارے دائیں ہاتھ کا اور دونوں ہاتھوں سے کوشش کر کے کچھ مطلب بھی نکال سکتے تھے؛ چنانچہ پہلے روز جب عربی کتاب فر فر پڑھ ڈالی تو برگیڈئیر صاحب حیران رہ گئے اور استادِ مُحترم تو پھڑک ہی اُٹھے۔ جب اُنہیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری عربی دانی کی وجہ ہماری مُسلمانی ہے تو آپ نے خوش ہو کر حلق کی گہرائی سے ایک بَل کھاتی ہوئی الحمدُ لِللہ نکالی۔ جواباً ہم نے بھی یرحمک اللہ پیش کی جو اپنے وطن میں تو چھینک مارنے کے سِلسلے میں اِستعمال ہوتی ہے۔ لیکن اِس موقع پر بھی خاصی صفائی سے چپک گئی۔ احتیاطاً ہم نے ایک ہلکی سی مصنوعی چھینک بھی چھینک دی کہ اِن مُقدّس تراکیب کے ٹیکنیکل اِستعمال کی صحّت بھی برقرار رہے۔

باتوں باتوں میں برگیڈئیر صاحب ہم سے فارسی میں سوال کر بیٹھے۔ ہمارے مُنہ سے محض اتفاقاً ایک چُست ساجواب نِکل گیا۔ برگیڈئیر صاحب مرعُوب ہو کر کہنے لگے:

”ارے تمہاری تو فارسی بھی بڑی مضبوط ہے۔ بغداد جا کر امتحان کیوں نہیں دیتے؟ پُورے چار سو روپے انعام مِلے گا۔“

ظاہر ہے اس دعوت کے قبول کرنے میں تکلّف کرنا بلوغت کشی کے برابر تھا۔ ہم نے بعجلتِ تمام اِمتحان کے لیے درخواست لکھی۔ اپنے ہم جماعت سے تصدیق کرائی اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی۔ قِصّہ مُختصر کوئی پندرہ دن بعد ہم رشید سٹریٹ بغداد میں ہوٹل قصرِ دجلہ کے مہمان تھے۔

امتحان کی منزل آسان نکلی۔ انگریز ممتحن کے پہلے سوال کا جواب دیا تو غریب دونوں بازو بُلند کر کے بولا "Too Good" گُڈ تو ہم واجبی سے ہی تھے، لیکن یہاں سوال ہماری رائے کا نہ تھا، بلکہ ممتحن کی بصیرت کا تھا جس کی رُو سے ہمارا مقام مہ و پروین کے قریب نِکلا، چنانچہ فارسی زبان کے امتحان میں تو ہم پاس ہو گئے لیکن بغداد کی زندگی کے امتحان میں کسی قدر دُشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سکول کے دِنوں میں الف لیلہ پڑھی تھی تو ہمارے تصوّر کا بغداد ایک خوابوں کی دُنیا تھی۔ پُراسرار و حیرت انگیز۔ جہاں علی بابے دبے پاؤں مٹکے اُٹھائے پھر رہے ہوں ابو الحسن سو جاگ رہے ہیں۔ نیم برہنہ حسین کنیزیں رقص کر رہی ہوں۔ ایک کونے میں الہٰ دین چراغ رگڑ رہا ہو اور کانا حجام آستین میں دشنہ چھُپائے گھات میں بیٹھا ہو لیکن جو بغداد ہمارے سامنے تھا اس میں کوئی اسرار تھے نہ رموز، علی بابا تھا نہ الہٰ دین۔ نئے اور الف لیلہ کے بغداد میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی، سوائے نیم برہنہ رقاصاؤں کے جو اَب اور زیادہ برہنہ ہو گئی تھیں اور شاہی محلوں کی خلوت کی بجائے کٹ کیٹ کی جلوت میں ٹکٹ لگا کر ناچتی تھیں۔

گیارہ کی بے زَن دُنیا سے ہم اپنے اُجاڑ دِل میں رنگ بھرنے آئے تھے۔ وُہ بھر لیا یا یوں سمجھیے کہ بغداد نے بزور بھر دیا۔ شارع الرشید کا وہ رَواں دَواں حُسن کہ شوخ بھی تھا اور بے حجاب بھی اور ہوٹل قصرِ دجلہ کی وُہ رنگ و بُو میں ڈوبی ہوئی شبینہ تقریبات کہ جہاں حُسن آمادۂ ظہور ہی نہ تھا، مائلِ کرم بھی تھا۔ ایک واقعہ کبھی نہ بھُولے گا۔

سرِ شام قصرِ دجلہ کے چمن میں ایک حسین و جمیل مخلوط مجمع میں ہم چند افسر اپنے مشروبات پر محوِ گُفتگُو تھے۔ کیپٹن سٹِمسن وہسکی کے زیرِ اثر اپنا ناپاک فلسفہ بیان کر رہے تھے کہ یہاں ہر عورت کی کچھ قیمت ہے اور ہم اِس سُوءِ ظن پر لعنت بھیج رہے تھے کہ باہر سڑک پر ایک کیڈی لاک کار رُکی۔ شوفر نے اَدب سے دروازہ کھولا۔ اندر سے دو وجیہہ اور باوقار خواتین برآمد ہوئیں۔ ہوٹل کے خادموں نے جھک کر سلام کیا۔ معلُوم ہوتا تھا کسی بڑے گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ چلیں، تو ایک واضح تمکنت اور شان سے۔ آخر ٹیرس کی کونے والی میز پر جا بیٹھیں۔ ہم نے سٹِمسن سے کہا:

”اب کہو تمہارا گُستاخ کلیہ اِن معزّز خواتین پر بھی حاوی ہے؟“

بے لگام سٹِمسن کو بھی ہاں کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ لیکن شکست خوردہ سا مُنہ لے کر رہ گیا۔ ہم نے شور مچایا۔ ”ہار گئے۔ ہمیں DRINKS پلاؤ۔“ سٹِمسن نے سرِ تسلیم خم کیا۔ مزید مشروبات کا آرڈر دیا اور آرڈر دیتے ہوئے بیرے کے کان میں کچھ کہہ دیا۔

بیرے نے جاتے ہوئے اُن خواتین کا بھی آرڈر لیا اور کچھ دیر کے بعد گلاسوں سے بھری ہوئی ٹرے لے آیا۔ ہمارے سامنے گلاس رکھّے، تو سٹِمسن کے سامنے گلاس کے علاوہ ایک کاغذ کا پُرزہ بھی رکھّا جس پر زنانہ ہاتھ سے لکھّا تھا: ’’عشرہ دنانیر (دس دینار)‘‘!

اب سٹِمسن کا پہلا اور جائز مطالبہ یہ تھا کہ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جھُک کر سلام کرو۔ اِس پر ہم نے خوشی اور خاموشی سے عمل کیا۔ اس کا دُوسرا اور ذرا کم جائز مطالبہ یہ تھا کہ ہفتہ بھر اپنے پیسوں سے وھسکی پلاؤ۔ اِس پر ہم نے نہایت با آواز ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن بہر حال عمل اس پر بھی کرنا پڑا۔

سو ہم چاہتے تو اپنی بلیک اینڈ وائٹ زندگی کو مکمل طور پر ٹیکنی کلر میں بدل دیتے، لیکن سچّی بات ہے ہم میں اِتنے شوخ رنگوں کی تاب نہ تھی اور بہر حال اِس مالِ فروخت میں وہ کشش نہ تھی کہ ہم دولتِ دِل مع ڈیلی الاؤنس [۲۳] ان کے آگے ڈھیر کر دیتے، لیکن یہ کہنا بھی ریاکاری ہو گی کہ ہم نے قصرِ دجلہ کے حادثے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی اور قیامِ بغداد کے باقی ایام فقط یادِ خُدا میں گزار دیے۔ ہمیں گزارشِ احوال واقعی منظور ہے اور وُہ یوں ہے کہ ہمارے ایام بلکہ راتوں کا بیشتر حِصّہ کٹ کیٹ اور ’’ملہی الف لیلہ‘‘

---

۲۳ روزانہ بھتّہ

کے گرد و پیش ہی گزرا جو وہاں کے مشہور کیبرے تھے، اگرچہ وہاں بھی ہماری کوشش کا مرکز اپنے وطنی افسروں کی صحبت تھی نہ کہ عربی رقص۔

رقص کے معاملے میں ہر مُلک کا اپنا مذاق ہے۔ ہندو پاکستان میں رقص کے عناصر چشم و ابرو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات ہیں اور جس قدر نزاکت اِن چار عناصر میں ہو، رقص اِتنا ہی دِلفریب ہوتا ہے۔ بخلاف اِس کے عربی رقص کا پہلا لازمہ عُریانی ہے اور دُوسرا کولہوں اور چھاتیوں کی جنبش۔ عُریانی جس قدر دُور رس اور جنبش جتنی طوفانی ہو رقص اِتنا ہی لاثانی تصوّر ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب ایک عراقی رقاصہ کو تقریباً کپڑوں کے بغیر دیکھا تو بِدک سے گئے اور جب مُعاملہ جنبائیٔ بدن تک پہنچا تو باور نہ آتا تھا کہ بھری محفل میں یوں بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہوتا رہا اور ہم دیکھا کیے۔ پہلے ذرا کانی آنکھ سے، پھر جیسے کتاب پڑھی جاتی ہے اور وُہ جسے ذوقِ سلیم کہتے ہیں، اِس مدّوجزر کی نذر ہو گیا جو اِن رقاصاؤں کی سینہ زوری سے پیدا ہو کر تماشائیوں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہمیں کٹ کیٹ اور ملہی الف لیلہ میں وُہ بات نہ مِلی جو ہندوستان کے مہ سیماؤں میں تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے رقص اور عربی رقص میں وہی فرق محسوس ہوا جو ستار نوازی اور ڈھول بجانے میں یا گلاب اور گوبھی کے پھول میں ہے، لیکن یہ ہمارا نقطۂ نِگاہ ہے۔ ممکن ہے عرب حضرات ہمارے لطیف اور رمزیہ رقص کو دیکھیں تو کہیں۔ ''کیا واہیات چیز ہے، نہ کولہا ہلتا ہے، نہ چھاتی پھڑکتی ہے، یہ تو مساکین اور یتامی کا

رقص ہے۔"

مشرقِ وسطیٰ کے مُسلمانوں کا ہمارے دِلوں میں پیدائشی احترام ہے، مگر اِن ممالک میں جا کر یہ احترام ذرا ڈگمگانے لگتا ہے۔ اِس میں قصُور دراصل عربوں کا نہیں، ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے اُنہیں محض عرب ہونے کی وجہ سے تقدیس کی روئی میں لپیٹ رکھا ہے اور اُن سے سوائے اس کے توقع ہی نہیں رکھتے کہ صُبح اُٹھیں، وضو کریں اور دِن بھر اذانیں دیتے رہیں، یا نفل ادا کرتے رہیں۔ ہم یہ بھُول جاتے ہیں کہ عرب بھی ہماری طرح گوشت پوست کے اِنسان ہیں اور سینے میں دِل رکھتے ہیں اور جو وقتاً فوقتاً بھر بھی آتا ہے بلکہ جغرافیائی مجبوریوں سے کچھ زیادہ ہی بھر آتا ہے۔ گویا دِل کے معاملات میں عرب بھائی بالکل ہماری طرح ہی بے بس ہیں اور اُن سے تھوک نیکیوں کی توقع صریح زیادتی ہے۔

البتّہ ایک معاملے میں عرب ہم سے بہت آگے ہیں اور وُہ ہے قرأت۔ عرب قاری کی آواز میں ایک جادو ہے اور لَے میں ایک سحر، ہم نے جب بھی عربوں کی زبان سے قرآن سُنا، وجد میں آ گئے۔ لیکن ایک معاملے میں عرب نہ صرف ہمیں وجد میں نہ لا سکے، بلکہ اُلٹا چکر میں ڈال دیا اور یہ تھا اُن کا طریقۂ نماز۔ ایک دفعہ جو کچھ ہم نے دیکھا وُہ بظاہر تھی تو نماز ہی، لیکن عجیب فری سٹائل (FREE STYLE) کی عبارت تھی۔

عید کا دِن تھا اور برادرِ عزیز اصغر[۲۴] مُصر ہوئے کہ بَصرہ مسجد میں جا کر نمازِ عید ادا کریں گے۔ پہلی مسجد کے دروازے پر پہنچے تو قفل پڑا تھا۔ خانۂ خُدا اور مقفّل؟ چلو۔ کوئی مصلحت ہو گی۔ دُوسری مسجد میں گئے۔ خیر سے کھُلی تھی۔ وضو کر کے اندر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ نمازِ عید با جماعت نہیں بلکہ فرداً فرداً پڑھی جا رہی ہے۔ حیران ہوئے لیکن کہا "چلو اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔" یہ دیکھ کر البتّہ خوشی ہوئی کہ مَردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک نماز تھیں، لیکن اس کے بعد ہم نے کچھ ہوتے دیکھا اور اسے دیکھ کر ہماری خوشی پہلے حیرت اور پھر وحشت میں بدلنے لگی۔

ابھی ہم نے نماز شروع نہ کی تھی کہ ساتھ کے نمازی عین نماز کے درمیان سَر پھیر کر نہایت بے تکلّفی سے ہمیں تکنے لگے۔ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اصغر کو اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ہم سے خیریت مزاج بھی پُوچھتے ہیں۔ لیکن شاید "آمین" تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک منہ خانہ کعبہ کی طرف کر کے رکوع میں چلے گئے۔ مَیں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصغر بولے: "ادھر دیکھنا۔" اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھی خاتُون جو التّحیات میں ہیں، دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں ایک سُلگتا سگریٹ تھام رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً نہایت تسلّی بخش سا کش لگا لیتی ہیں اور خانۂ خُدا میں نیلے دھوئیں کے مرغولے اور محرابیں تعمیر کر رہی

---

۲۴ میجر سیّد اصغر حسین: آج کل کیپیٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے مشیر مالیات ہیں۔

ہیں۔ حیران تھے، لیکن کیا کہہ سکتے تھے سوائے اس کے کہ

یہ مُعاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تُو کر

نماز پڑھی اور باہر آ گئے۔

ذِکر بغداد کی تفریحات کا تھا۔ زمانۂ جنگ میں اخلاق کے بندھن کسی قدر ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور بغداد کا ماحول بھی اخلاقی صحّت کے لیے ایسا سازگار نہ تھا، بلکہ دِل و نظر کا سفینہ سنبھالنے کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایسی ہی کوشش ہمیں بغداد سے نکال کر نجف و کربلا لے گئی۔ ہوٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک اور سیکنڈ لیفٹیننٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وُہ بھی ساتھ ہو لیے۔ کربلا پہنچے، تو معلّمین نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مختلف مقامات دکھائے۔ ہم دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ فوراً باقی زائرین خصوصاً بچّوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جدھر جاتے، ایک چھوٹی سی فوج تعاقب میں ہوتی۔ معلّم نے اُنہیں بھگانا چاہا، لیکن انہوں نے یک زبان ہو کر کچھ عربی آوازیں نکالیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں یہ عربی میں لاہوری ''اوئے اوئے'' کا ہم معنی کورس نہ شروع کر دیں۔ معلّم کو ٹوک دیا اور تعاقب کنندگان سے مصنوعی خندہ پیشانی سے اشارے کیے۔

بالآخر حضرت امام حسین کے روضے میں داخل ہوئے جہاں نہ صرف اِن لونڈوں سے

امان ملی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے تمام زبانی و روحانی آلائشوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ فاتحہ پڑھی اور دیر تک مقبرے کی جالی تھامے کھڑے رہے۔ یہ وُہ مقام ہے جہاں آنکھیں تَر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

کربلا سے نجف پہنچے۔ یہاں کا ماحول کسی قدر مختلف تھا۔ یہاں ہندوستانی مُسلمان خاصی تعداد میں تھے، مگر اکثر غریب اور نادار۔ روضے سے ایک فاصلے پر ٹیکسی سے اُترے، فوراً ایک ہم وطن ہماری طرف بڑھے اور میرے ساتھی کو جمعدار صاحب کہہ کر سلام کیا۔ اپنی لفٹیننی کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں مسمار ہوتے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ غریب کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگے:

"او بھِک منگے! تُو نے بیک جنبشِ لَب مُجھ فُل سیکنڈ لیفٹیننٹ کو جمعدار بنا دیا۔ تمہاری یہ مجال؟" اس کے بعد آپ نے اُسے غلط انگریزی میں چند گالیاں دیں جسے اُس نے صحیح سمجھ کر بُرا مانا کہ لفٹین صاحب کی نیت بہر حال صحیح گالیوں کی تھی۔

حقیقت میں سائل بیچارے کا قصُور نہ تھا کہ اُن دِنوں جمعداروں اور لفٹینوں کے کندھوں کے نشانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں ایک سے پیتل کے ستارے لگاتے تھے اور آج کل کا امتیازی فیتہ جمعداروں کو نہ مِلا تھا، چنانچہ لفٹین صاحب کو بہت سمجھایا، لیکن نہ مانے۔ کہنے لگے:

”جمعدار پگڑی باندھتا ہے، میرے سر افسرانہ ٹوپی ہے۔ کیا یہ اندھا ہے؟ پگڑی اور ٹوپی میں تمیز نہیں کر سکا؟“

ذرا ہنس کر عرض کیا: ”معاف کر دیں غریب کو ذرا بھینگا ہے شاید OPTICAL ILLUSION25 کی وجہ سے غلطی کر گیا ہے۔“

بولے: ”گویا تم بھی سائنس کی مدد سے میری ہتک کرتے ہو۔“

اب معلوم ہوا کہ قبلہ لفٹین صاحب بھی ذرا دماغ کے بھینگے ہیں۔ بڑی مشکل سے اُنہیں راضی کیا اور آگے روضے کی جانب بڑھے، لیکن دفعتہً لفٹین صاحب رُک گئے اور کہنے لگے۔:

”امیر المومنین کے روضے میں جانے سے پہلے خیرات بانٹنی لازم ہے۔“

آپ سید تھے۔ مَیں سمجھا اِن رموز سے واقف ہیں۔ چلو، انہیں خیرات بانٹنے دو۔ آپ نے جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا اور اپنی ہندوستانی زبان سے عرب ڈرائیور کو انگریزی میں حکم دیا کہ اس کی ریزگاری لے آؤ کہ غُربا میں تقسیم کر دی جائے۔ ڈرائیور نے دِل میں ہندوستانی انگریزی کا عربی ترجمہ کر کے سمجھا کہ اِسے خود ہی دینار

---

25 فریبِ نظر

بھُنا کر غُربا میں تقسیم کرنا ہے۔ غُربا کی وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ ڈرائیور پانچ منٹ میں اِس کارِ خیر سے فارغ ہو کر آ گیا۔ لفٹین صاحب بولے:

"اُچکّے کہیں کے، ہمارے ساتھ دھوکا؟ جاؤ جن جن غریبوں کو خیرات دی ہے اُن سے واپس لاؤ۔ ہم اپنے ہاتھ سے بانٹیں گے۔"

ڈرائیور سمجھ گیا، سواری عقل سے عاری ہے۔ جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا، اپنے سر پر پھیرا اور چُوم کر قبلہ لفٹین صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لفٹین صاحب کے شور و غل سے بھکاری تماشے کی خاطر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اِس گہما گہمی نے خیرات کو تقسیمِ انعامات کی تقریب بنا دیا۔ آخری پیسہ ختم ہو چُکا۔ تو جناب نے خطبۂ صدارت دینا چاہا، لیکن خوش قسمتی سے بھکاریوں نے اس میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور جب سامعین میں فقط یہ خاکسار اور ڈرائیور رہ گئے۔ شاہ صاحب نے ہمیں روضے کی زیارت کی اِجازت بخش دی۔

الغرض جب واپس بغداد پہنچے، تو آدھی رات کا عالم تھا۔ لفٹین صاحب نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تجویز فرمایا کہ کل کاکاظمین کی زیارت کی جائے۔ ارادہ تو ہمارا بھی تھا، لیکن اُن کی رفاقت کا شوق سرد ہو گیا تھا؛ لہٰذا ہمرکابی سے عُذر کر دیا۔ دُوسرے روز کاظمین پہنچے تو آگے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہوا دو آدمی گُتھم گُتھا

ہیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو فریقین میں سے ایک ہمارے لفٹین صاحب ہی تھے۔۔۔ اس کے بعد ان لفٹین صاحب کو آج تک نہیں دیکھا۔ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاید اُدھر ہی ہوں۔ بہر حال جہاں ہوں خُدا اُنہیں خوش رکھے۔ اگرچہ اِس مُعاملے میں وُہ خُدا سے تعاون کرنے والے نہ تھے۔

آخر ہمارا بغداد کا قیام ختم ہوا۔ واپس کیارہ پہنچے، تو بریگیڈ موصل کو کوچ کر رہا تھا جو پچاس میل شمال میں تھا۔ گویا پچاس میل اور ہٹلر کے قریب۔ اِس نقل مکانی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شمال سے ہٹلر بھی اسی قدر ہماری جانب بڑھنے کی زحمت اُٹھا رہے ہیں اور چونکہ مُلاقات کا امکان سا ہے لہٰذا معزّز مہمان کو چند قدم بڑھ کر ملنا لازم ہے۔

موصل پہنچے تو آفیسرز میس اور چند سینئر افسروں کے لیے موصل شہر میں عمارت مِل گئی۔ باقی سپاہیوں اور ہم جونئیر افسروں نے شہر سے چند میل باہر خیمے گاڑے۔ انداز یہ ہوتا تھا کہ جتنی جگہ خیمہ گھیرتا ہے اُسے دو تین فٹ گہرا کھود دیا جاتا تھا۔ اِس سے ایک تو گہرائی کے سبب خیمے کے اندر چلنا پھرنا آسان ہو جاتا تھا اور دُوسرے اندر بیٹھے یا لیٹے ہوئے دُشمن کی گولی کارگر نہ ہوتی تھی۔ دن بھر سپاہیوں کے ساتھ کام کرتے، لیکن کھانے کا وقت اور خصوصاً شام میں میس گزارتے یا موصل کی گشت کرتے جہاں وہی بصرہ و بغداد کے رنگ تھے، لیکن ذرا کم شوخ۔ رات بہر حال کیمپ میں آجاتے۔

ایک رات اِس زور کی بارش ہوئی کہ بقول شخصے سات آسمان گِر پڑے۔ ذرا بادل چھٹے تو رات کے دو بجے کیچڑ سے لَت پَت میس میں سے کیمپ پہنچے۔ آگے خلافِ معمول ہمارا اردلی سِگنل مین ہر بنس کے انتظار کر رہا تھا۔ غریب ہڈیوں تک بارش سے بھیگ چُکا تھا اور اچھّا خاصا چڑ اپُو نجی بنا کھڑا تھا۔

مَیں نے پُوچھا۔ ''اِتنی رات گئے اِنتظار کی ضرورت؟''

بولا: ''صاحب، وہ گُم ہو گیا ہے۔''

''کیا گُم ہو گیا ہے؟''

''آپ کا تنبو، جی۔''

''تنبو کیسے گُم ہو سکتا ہے؟''

''جی اُڑ گیا ہے۔ طوفان جو آیا تھا۔''

''اور ہمارا سامان؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یعنی؟''

”خیمے کا گڑھا پانی سے بھر گیا ہے اور زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا ہے۔ صُبح ڈُبکی لگا کر دیکھوں گا۔“

”جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم کیا کر رہے تھے؟“

”جی، مَیں دیکھ رہا تھا۔“

ہر بنس سنگھ اِس دیکھتے رہنے کی وجہ سے اپنے آپ کو شاباش کا مُستحق سمجھتا تھا۔ اُسے شاباش دی اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ رات واپس میس میں جا کر اُدھار کے بستر پر گُزاری۔ صُبح کیمپ میں آئے، تو ہر بنس سِنگھ میں ملبوس مُسکراتا ہوا آگے بڑھا اور بولا:

”صاحب، آپ کی لوہے کی کرسی خیمے کے گڑھے میں سے مِل گئی ہے۔“

مَیں نے کہا: ”شاباش اور باقی سامان؟“

ہر بنس سِنگھ کی مُسکراہٹ ذرا کملانے لگی۔ بولا: ”باقی سامان تو دَجلے میں پہنچ گیا ہے۔“

موصل سے طبرق ○ پندرہ سو میل کا سفر

ہماری نگاہیں موصل کے شمال میں کاکیشیا کے پہاڑوں پر جمی تھیں۔ کیونکہ اسی راستے سے ہٹلر کی آمد کی خبر گرم تھی اور استقبال میں ہمارے بریگیڈ نے گھر کے تمام بوریے بچھا رکھے تھے یعنی جس حد تک ایک بریگیڈ کی بساط تھی، بازی لگا دی تھی۔ اُدھر ہٹلر کا لشکر کئی ڈویژنوں پر مشتمل تھا اور کہا جاتا تھا کہ اگر وُہ ستم گر اِدھر آ نِکلا تو ہمارے بریگیڈ کے پُرزے اُڑیں گے۔ ہم اس کے لیے بھی تیار تھے، لیکن بالآخر یہ تماشا نہ ہوا اور ہوا یہ کہ عین اس وقت کہ ہم ہٹلر کی خنجر آزمائی کے لیے موصل کے نواح میں مقتل آراستہ کر رہے تھے اُس کی نِگاہ روس کے کفن بدوشوں پر پڑی اور ظالم نے اُن کے مُقابلے میں ہمیں قابلِ التفات نہ سمجھا۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا سِتم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذّتِ آزار دیکھ کر

اب ہم اس خیال سے نڈھال ہونے لگے کہ شاید موصل میں ہی بیٹھے بیٹھے بے مصرف بُوڑھے ہو جائیں گے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کہاں قسمت آزمانے جائیں کہ اچانک شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم سے ایک نئے خنجر آزما یعنی جنرل رومل[۲۶] نے ہمیں یاد کیا۔ اُس وقت رومل مغرب سے مِصر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور بِن غازی کی گوشمالی اور پھر اشک شوئی کرتا ہوا اپنی دُور مار توپوں کے ذریعے طبرق کی ابتدائی مزاج پُرسی کر رہا تھا، لیکن پیشتر اس کے کہ اہلِ طبرق کوئی مُناسب جواب دینے کی ہمّت کر سکتے، ہمارے بریگیڈ کو حکم ہوا کہ موصل سے طبرق پہنچو، یعنی کوئی ڈیڑھ ہزار میل مغرب کو؛ چنانچہ فی الفور ایک طویل سفر کی تیاری ہونے لگی۔

نقشہ دیکھا، تو معلوم ہوا کہ موصل سے فلسطین کے ساحل تک پائپ لائن ہماری رفیقِ سفر ہو گی اور اس سے آگے نہر سویز کے پار افریقہ کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ ساحلی سڑک۔ گویا تمام تر راستہ صحرا سے گزرتا تھا اور اس طویل صحرانوردی کے انجام پر کوئی لیلیٰ نہ تھی بلکہ رومل:

---

۲۶ صحرائے افریقہ میں لڑنے والی جرمن افواج کا نامور جنرل

۵ مئی ۱۹۴۲ء کو موصل سے کوچ کیا اور جنوب میں بغداد سے سترہ میل اِدھر بیجی کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں ہفتہ بھر ٹھہر کر نیا ساز و سامان اور اسلحہ و بارود حاصل کیا اور سفر طبرق کی تیاری کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سفر آخرت کی تیاری ہے۔ کیونکہ رومل سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال ۲۲ مئی کو ہمارا ۱۲ روزہ صحرائی سفر شروع ہوا اور علی الصُبح بریگیڈ کی سینکڑوں مختلف النسل گاڑیاں جوانوں اور سامان سے لدی ہوئی ایک خاص ترتیب سے سڑک پر نکلیں اور کارواں مغرب کو روانہ ہوا۔

کارواں میں سفر کرنے کے آداب خاصے کڑے ہوتے ہیں۔ گاڑیوں کی رفتار اور اُن کے درمیانی فاصلے مقرّر ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی ڈرائیور تیز مزاجی میں اپنے پیش رَو سے آگے نکل سکے؟ کوئی یہ غلطی کرے، تو بالیقین اُس کے پَر جل جانے کا اندیشہ ہے کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی! اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ اگر وُہ ہر کارواں شِکن کی دلنوازی کرتا پھرے، تو پھر کارواں کا اللہ حافظ! اور ایسے بگڑے ہوئے کاروانوں کی حفاظت اللہ کی عادت نہیں۔ کارواں سے ٹوٹنے کا فقط ایک ہی جائز بہانہ ہے کہ چلتے چلتے آپ کی گاڑی کا انجن جاں بحق ہو جائے، لیکن ایسے انجنوں کا مسیحا بھی کارواں کے ساتھ ہی چل رہا ہوتا ہے۔ اُسے غیر دینی زبان میں بریک ڈاؤن لاری کہتے ہیں۔ اور اس کی ایک پھُونک مُردہ انجن کو صبا رفتاری پر آمادہ کر دیتی ہے اور اگر پھُونک

کارگر نہ ہو تو نہ سہی، مرگِ عاشق یوں بھی بے معنی چیز ہے اور اس مسیحا کو اپنی بات جانے سے کوئی خفت بھی نہیں ہوتی۔ مرحوم کو سرِ راہ چھوڑتے ہوئے باقی کارواں مع مسیحا رواں رہتا ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا کہ ہمارا کارواں مجورا کے مقام پر رات کے قیام کے لیے رُکا۔ مجورا کیا بلا تھی، ہمیں نظر نہ آئی۔ لَق و دق صحرا تھا۔ دُشمن کے ہوائی جہازوں کا ایسا خطرہ تو نہ تھا، لیکن کارواں سالار نے مورچے کھودنے کا حکم دے دیا اور کھُلے میدان میں سگریٹ پینے یا روشنی کرنے پر پابندی لگا دی۔ زندگی تلخ کرنے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بڑی پابندیوں سے کہیں زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔ بہر حال جائے اعتراض نہ تھی۔ دِن کا کھانا ہم نے چلتی گاڑیوں میں ہی کھایا تھا، لیکن اب باقاعدہ میس کا خیمہ نصب ہوا۔ میزیں لگائی گئیں، انگریزی دستور کے مطابق کھانا چُنا اور کھایا گیا اور مشروبات نوش کیے گئے۔۔۔ فوجی زندگی کا یہ قرینہ بے حد دلکش ہے۔ اِس زندگی میں جفاکشی بھی قیامت کی ہے، لیکن اِن جفاؤں کے درمیان اگر ایک لمحہ فرصت کا میسّر ہو یا دُشمن مُہلت دے، تو بزمِ طرب آراستہ ہو جاتی ہے۔

یہ لکھتے ہوئے بریگیڈیئر فِنڈلے (FINDLEY) کا واقعہ یاد آتا ہے۔ قبائلی علاقے کے سلسلۂ کوہستان میں فوجی مشقیں کر رہے تھے کہ چار و ناچار ایک رات پہاڑ کی دندانے دار ڈھلان پر گزارنا پڑی۔ خیال تھا کہ یونہی کسی چٹان سے ٹیک لگا کر شبِ سحر

کر دیں گے کہ بر گیڈ ئیر فنڈلے کو اپنا بستہ اپنے ہاتھ سے کھولتے ہوئے دیکھا اور بیحد حیرت ہوئی، کیونکہ بر گیڈ ئیر صاحب صرف تین چوتھائی اصلی تھے اور باقی مصنوعی۔ یعنی آپ کی ایک ٹانگ اور بازو چوبی تھے۔ اصلی اعضاء ایک جنگی حادثے میں ضائع ہو گئے تھے۔ باوجود اِس کے کہ آپ نے پہلے چارپائی کے برابر جگہ ہموار کی، پھر سفری پلنگ لگایا، بستر بچھایا، سفری میز اور کرسی نکالی۔ میز پر بیئر کی بوتل اور گلاس رکھے اور ایک سکون کے عالم میں مے نوشی شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک ٹوٹے پھوٹے بر گیڈ ئیر کی بجائے کوئی جواں سال شاعر بیٹھا ہے جس نے انتہائی سنگلاخ زمین میں ایک شگفتہ غزل کہہ ڈالی ہے۔

جب بر گیڈ ئیر صاحب نے ہمیں دیکھا کہ سوالیہ نشان بنے بیٹھے ہیں، تو ہنسے اور کہنے لگے:

ANY FOOL CAN MAKE HIMSELF UNCOMFORTABLE[27]

بر گیڈ ئیر صاحب کی چوٹ سے ہمارے سالم دست و پا حرکت میں آگئے اور منٹوں میں پہاڑ کی ڈھلان پنڈی کلب کی طرح آراستہ ہو گئی۔

---

27 کوئی بے وقوف ہی بے آرامی سے بسر کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

ہر جا کہ رفت خیمہ ند و بار گاہ ساخت

لیکن حقیقت میں شرط منعم ہونا نہیں، بلکہ ایک خاص ذہنی کیفیت کی ضرورت ہے اور زندگی سے ہر رنگ لُطف اندوز ہونے کا ذوق ہے ورنہ فوجی بے چارے کہاں کے منعم ہیں؟

رات آرام سے گُزاری اور صُبح سویرے پھر سڑک پر تھے۔ سڑک سے آپ مال لاہور کی قسم کی کوئی چیز تصوّر نہ کر لیں جسے پی ڈبلیو ڈی نے اپنے صدری نسخوں سے سجایا بنایا ہو، بلکہ ہمارے سامنے عراق کا وسیع صحرا تھا جس کی مغربی سرحد فلسطین سے جا ملتی تھی اور یہ شاہراہ سینۂ صحرا پر لاریوں کی متواتر آمد و رفت سے خود رَو سی سڑک بن گئی تھی جو "ٹارمیک" نہ سہی، پختگی اور ہمواری میں مال سے ٹکر کھاتی تھی اور کشادگی میں تو ظرف تنگ ہائے مال کا اِس سے کچھ مقابلہ ہی نہ تھا۔ سڑک کی وسعت صحرا کی وسعت کے برابر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اِس پر ایک مقرّر سمت میں سفر کرنے کے لیے دن کی روشنی درکار تھی۔ رات کے مُسافر اس کی کشادگی میں کھو کر رہ جاتے تھے، اِسی لیے ہمارا قافلہ سرِ شام ہی کسی موزوں مقام پر رُک کر ڈیرے ڈال دیتا تھا۔

ہمارے اگلے پڑاؤ کچھ ابجد ہوز کی قسم کے تھے۔ ان کے کاغذی نام تھے ایل جی ۵، ایچ ۳، ایچ ۴ وغیرہ۔ اور ان کے مُقابلے میں زمین پر یا ہوائی اڈّہ تھا یا پمپنگ اسٹیشن، جیسے مصنوعی نام تھے ویسے ہی مصنوعی مقام تھے، لیکن اگر ہمارے راستے میں یہ مقامات نہ ہوتے تو پھر اِس دشت میں فقط خُدا کی ذات ہی تھی۔ کہیں کہیں اِس بیکراں ویرانے میں خانہ بدوشوں کے خیمے بھی نظر آتے تھے جن کے اردگرد چند اِنسان کچھ گدھے اور ایک کثیر تعداد بھیڑوں کی پھر رہی ہوتی تھی، جنہیں دیکھ کر اُس کی رزاقی پر ایمان آ جاتا تھا۔ یہ بدّو تو خیر بھیڑیں کھا لیتے ہوں گے، لیکن وُہ بھیڑیں کیا کھاتی تھیں؟ یہ راز بھیڑوں اور اُن کے رازق کے درمیان ہی تھا۔ بہر حال یہاں سمندر سے نہیں، بلکہ صحرا سے پیاسے کو شبنم ملتی تھی جو یقیناً رزّاقی تھی۔

پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا۔ پُل سے پار ہوئے، تو ایک نئی دُنیا میں داخل ہو گئے۔ حدِّ نِگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نِگاہ ایک پِک نِک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انہوں نے ہمارا کانوائے دیکھا، تو ہماری طرف لپکیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، پُوری سات دوشیزائیں! خدا جانے اِن بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دِن دہاڑے عُریاں ہو گئیں۔ یعنی تقریباً عُریاں! پیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نِکلی تھیں۔ ہم نے اُنہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی! ہمیں دیکھ کر تو خیر اُنہیں کیا حاصل ہونا تھا، لیکن ہم سکتے

میں آ گئے۔ ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رُک گئی۔ ساتوں کی سات سَرو قد آہو چشم اور مرمریں بدن۔ اِس قدر دِلرُبا جیسے غالب کی غزل، اِسے دیکھو تو زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے۔ اُسے دیکھو تو سُرمے سے تیز دشنہ مژگاں کیے ہوئے اور وُہ جو ذرا ہٹ کر مُسکرا رہی تھی: چہرہ فروغِ مے سے گُلستاں کیے ہوئے، اور ہم کہ مُدّت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے جگرِ لخت لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔

بعد میں سُنا کہ ہمارے سالارِ کارواں بھی اِس حُسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیر کے لیے سالار سے اِنسان بن گئے اور جیپ روک کر اُنہیں ہیلو کہا اور چلے تو ایک مُدّت تک پیچھے تاکا کیے۔ جب مقامی لوگوں سے پُوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نو بہارِ ناز کون ہے، تو معلوم ہوا کے دُخترانِ یہود ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اُردن عُبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں۔

فلسطین کی اُٹھان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے۔ انگریز اسے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے اور ہمیں تو صحرائے عراق کی ریت اور لاوے کی درشتی کے بعد فلسطین کا سبزہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زیرِ پاچُوں پرنیاں آمدہے: چھوٹی چھوٹی یہودی بستیوں سے گُزرتے تو معلوم ہوتا ٹیکنی کلر میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ وُہ رنگا رنگ کاٹیج، وُہ مدرسے کی سُرخ و سپید عمارت، وہ دلکش سینما ہال، وُہ دلآویز سیناگاگ اور مکانوں سے کہیں زیادہ حسین ان کے مکین جنہیں سات دن کی مسلسل دشت پیمائی کے بعد دیکھنے کو اگر ٹکٹ بھی لگتا

تو ہم فوجی رعایت نہ مانگتے۔ اور اب کہ یہ لوگ برضا و رغبت ہمارے کارواں کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے، ہم اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرتے آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا اُس شام کا پڑاؤ حیفہ تھا۔ حیفہ سے کوئی ایک میل ادھر ہمارا کارواں رُکا اور ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ بریگیڈ کمانڈر صاحب نے شاید ہمارے دِلوں کو ٹٹول لیا۔ سرِ شام ہی اعلان کر دیا کہ حیفہ دیکھنے کی عام چھٹی ہے۔

۱۹۴۲ء میں اسرائیل ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن یہودی فلسطین پر چھا رہے تھے اور حیفہ تو ایک پکے ہوئے پھل کی طرح اُن کی گود میں گرنے کو تھا۔ اکثر یہودی یورپ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ نتیجتاً حیفہ کا مزاج نہ صرف عمارات بلکہ عام طرزِ زندگی میں بھی فرنگیانہ تھا۔ عرب تھے، لیکن کم اور وُہ بھی مزدور قسم کے۔ حیفہ کے مزاج کو متاثر کرنا تو درکنار، حیفہ کے مزاج دان ہی نہ تھے۔ بیچارے اپنے گھر میں اجنبی تھے۔

پہلی رات شہر میں گئے، تو ایک مشہور تفریح کدہ "پرانسز" میں جا داخل ہوئے۔ یہاں کے ماحول میں وُہ بغداد کے کیبروں کی گرج چمک اور ژالہ باری نہ تھی۔ اِس جگہ کی کشش کے عناصر حُسن اور سکون تھے۔ مرد باوقار اور

خواتین باتمکین، لیکن تمام یہودی۔ کوئی دیسی عرب وہاں موجود نہ تھا۔۔۔ بار پر گئے تو مقبول ترین مشروب مالٹے کا رَس نِکلا، لیکن یہ ہمارے ہم وطن مالٹے نہ تھے۔ پاکستانی مالٹے حیفہ کے مالٹوں کے سامنے برادرِ خُرد اور وُہ بھی سوتیلے نظر آتے ہیں۔ فلسطینی مالٹے نہ صرف قامت میں بُزرگ تھے بلکہ لذّت میں بھی دوآتشہ تھے۔ یہ ہوائے فلسطین کا فیض تھا یا یہودی محنت کا ثمرہ، اِس بات کی تحقیق تو نہ ہو سکی؛ البتّہ ہم نے دونوں ہاتھوں سے ایک مالٹا اُٹھا کر مشین میں رکھّا تو بار میڈ نے ایک رطلِ گراں بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور جب پی چُکے تو وُہ آسودگی میسّر ہوئی کہ اِس کی یاد مع ذائقہ آج تک باقی ہے اور اب گوجرانوالہ کے مالٹے اپنا خُونِ جگر بہا کر بھی وُہ بات پیدا نہیں کر سکتے۔۔۔ اُس رات ہم نے دیکھا کہ کئی مُستند انگریز مَے خوار اس نئے مشروب کی خاطر وہسکی سے دستبردار ہو گئے۔

دُوسرا دن بھی حیفہ کی سیر میں گُزرا۔ حیفہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے؛ لہٰذا وہ اپنے رُخِ زیبا کا کوئی گوشہ بھی چھُپا بھی نہیں سکتا اور نہ چھپانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اِس کا حُسن بندِ نقاب کھولے قوسِ قزح کی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ڈھلان خُدا نے بنائی ہے مکان اِنسان نے اور دونوں نے مل کر ایک شاہکار پیدا کر دیا ہے۔ ایک فیلسوف

ساتھی سے بات کی تو بولا:

”حیفہ پر ہی کیا منحصر ہے، ہر شاہکار فطرت سے تعاون کرنے پر ہی وجود میں آتا ہے، مسئلہ مشکل تھا، لیکن مثال کی مدد سے کچھ سمجھ میں آ گیا۔“

اگلے روز علی الصُبح ہمارا کارواں پھر روانہ ہوا۔ حیفہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کو بڑھے۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے باغیچوں کے تھے جن کے شاداب مالٹے آب و رنگ میں اُن یہودی دوشیزاؤں کو شرماتے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شرمائے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشتکار مشینوں سے صحرا کو گلزار بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ پھُول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار۔

پھر دفعتہً باغیوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطعاتِ زمین میں اُونٹوں اور گدھوں کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ عرب کاشتکار ہیں۔ کھیتوں کے قریب سے گُزرے تو عرب بچّے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر ”سگار رفیق“ کی صَدا لگانے لگے۔ صَدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہوا سگریٹ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے تو دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عربی بھائیوں کا کیا بنے گا۔

اور بنا یہ کہ چند سال بعد فلسطین جغرافیے سے نِکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اُس کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں مُنتقل ہو گئے اور بظاہر وہیں رہیں گے کیونکہ انرا (UNRRA) کے مُفت راشنوں کے علاوہ امریکہ کے خیراتی سگرٹوں نے اُن کے دِل سے یادِ وطن کی خلش خاصی مُلائم کر دی ہے۔ بلکہ سنا ہے کہ اُن کا قاف حلق کی بجائے اَب ناک سے نکلتا ہے۔[۲۸]

حیفہ کے بعد اگلا پڑاؤ اسلوج تھا۔ اسلوج صحرائے سینائی کے مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ اسلوج میں رات گزار کر صُبح دشتِ سینائی کی پہنائی سے گُزرے تو ویرانی سے خوف سا آنے لگا۔ انگریزوں نے اِس ریگزار میں یہ سڑک نہ بنائی ہوتی تو، اسمٰعیلیہ پہنچتے پہنچتے ایک عُمر گُزر جاتی اور شاید یہ تاخیر ہمارے لیے ایسی ناموافق بھی نہ ہوتی کہ رومل سے فوری مُلاقات بھی بہت صحّت افزا تقریب نہ تھی۔ خیر ہمارے جذبات کچھ بھی ہوں، سڑک بہر حال پکی تھی۔

شام کو نہر سویز عُبور کر کے اسمٰعیلیہ میں داخل ہوئے۔ رات کا بیشتر حصّہ اسمٰعیلیہ کلب

---

۲۸ یہ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کے تاثرات ہیں۔ فلسطین فدائین کے موجودہ جذبہ جان نثاری اور وطن پرستی کو مصنّف سلام کرتا ہے۔

میں گُزارا۔ کیونکہ تہذیب سے قریب ترین آخری شب تھی۔ اِس کے بعد صحرائے لیبیا کی راتیں تھیں اور جنگ کی بد تہذیبی۔

اسمٰعیلیہ کلب کے ماحول سے ہر طرف پُونہ (یا شاید پھُونہ کہنا زیادہ صحیح ہے) ٹپکتا تھا۔ لمبی مُونچھوں والے ادھیڑ عمر کے کرنیل اور جرنیل جا بجا بکھرے پڑے تھے جن کی خدمات سے محاذِ جنگ تو محفوظ تھا، لیکن کلب کا محاذ اُن کی ہمہ وقتی زَد میں تھا۔ اُن کی کلب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اُس کے فرنیچر کا حِصّہ معلوم ہوتے تھے؛ البتّہ کھاتا پیتا اور ناچتا گاتا فرنیچر؛ سوائے لڑنے کے ہر کام کے لیے تیار تھے۔ کلب کے سبز قطعات پر برقی پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر بیئر پینا اِن کا دُوسرا اہم کام تھا۔ خدمت کے لیے گہری لال ٹوپیوں والے اور گاڑھے کالے چہروں والے سوڈانی خدمت گار تھے جو پُونہ کلب کے بیَروں کے عم زاد معلوم ہوتے تھے۔ صِرف ”کوئی ہائے“ کی مانوس آواز نہیں آ رہی تھی۔

صُبح محاذِ جنگ کی طرف بڑھنا تھا لہٰذا رات کو ہمارے انگریز ساتھیوں نے معمول سے بہت زیادہ پی اور زیادہ دیر پی کہ جنگ پر جانے کی یہی اُن کی رِیت ہے۔ اِس خاکسار کے پاس کنارۂ سویز تو تھا، لیکن کوئی سفینہ نہ تھا کہ اُسے جلا کر مُسلمانوں کی رِیت پوری کرتا۔ ہاتھ اُٹھائے اور دُعائے خیر مانگی۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ ہم قاہرہ پُہنچے، بلکہ قاہرہ سے گُزرے کہ وہاں ٹھہرنے کی اِجازت نہ تھی۔ پاک وہند کے مُسلمانوں کے دماغ میں قاہرہ کا تصوّر سراسر جامعۂ ازہر کا تصور ہے۔ یعنی اہلِ قاہرہ یا رکوع میں ہیں یا سجود میں۔ ہاتھ میں کوزہ ہے یا تسبیح اور سر پر سُرخ رومی ٹوپی۔ لیکن قاہرہ کے بازاروں سے گُزرتے ہوئے اِس شہر کی جھلک دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہاں ازہر کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اُسے دیکھ کر جی چاہا کہ

اِک لمحہ یہاں دَم لُوں
دامن کو ذرا بھر لُوں
اُن پھُولوں کی خُوشبو سے
جو سامنے کھِلتے ہیں!

اور شاید نادانستہ طور پر دَم لینا شروع بھی کر رہا تھا کہ پچھلی گاڑی نے زور سے ہارن دے کر ہمارا رُومان پریشان کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دریائے نیل عُبور کیا جو شہر کے وسط سے بہتا ہے اور اہرام کی طرف بڑھے۔ مینا پہنچ کر ایک بلندی پر کھُلے صحرا میں داخل ہوئے اور غضب خدا کا یہاں یعنی قاہرہ کی بجائے صحرا میں۔۔۔ کانوائے نے دَم لیا۔ گاڑی سے نکل کر پیچھے قاہرہ پر نگاہ ڈالی کہ شاید اِنسانوں کی بستی پر یہ آخری نگاہ ہو۔ اور جب دیکھا تو ہمیں قاہرہ کا شاداب

نخلستان دکھائی دیا۔ جو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اُس کا تصوّر کر لیا اور یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کو بتدریج پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن خوفِ مرگ کے ساتھ ایک کونے سے یہ خیال بھی آنمودار ہوا کہ شاید بچ نکلیں اور کسی دِن واپس آ کر اِسی قاہرہ کی زندگی میں حِصّہ لے سکیں۔ بہر حال عین اُس وقت ہمارے دِل کے اندر بیم و رجا کے معرکے میں رجا کی حالت خاصی پتلی تھی۔

ہم کوئی چھ گھنٹے رواں رہے۔ دھوپ سے ہم اپنے وطن میں بھی مانوس تھے لیکن صحرا کی دھوپ یوں لگتی تھی جیسے عارضۂ قلب ہو رہا ہو؛ چنانچہ دِل کو تھامے بالآخر اسکندریہ کے قریب امریہ پہنچے اور رات کے لیے ڈیرے ڈالے۔ جوں جوں رات قریب آتی گئی، گرمی غائب ہونے لگی۔ نصف شب کو خنکی کا یہ عالم تھا کہ ٹھنڈا عارضۂ قلب ہونے لگا اور سپاہی دلیپ سِنگھ نے تو سچ مچ سینے پر دھر کے ہاتھ کہا "یار مَر گیا" اور مرنے لگا۔ حوالدار میت سِنگھ نے دن رات کے درجۂ حرارت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے نہایت وثوق سے کہا کہ یہ بیماری دِل کی نہیں اور نہ علاج کی ضرورت ہے۔ دلیپ سِنگھ محض گرم سرد ہو گیا ہے۔ صُبح کا انتظار کیا جائے کہ سَرد گرم ہو کر شفا پا لے؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ دلیپ سِنگھ نے آنکھ کھولی۔ سینے پر سے ہاتھ اُٹھایا اور مُسکرا دیا۔

اگلی صُبح ہمارا کارواں ساحلی سڑک کے راستے سلوم کو روانہ ہوا۔ جوں جوں سُورج بُلند ہوتا گیا ہمارا درجۂ حرارت بھی بُلند ہونے لگا۔ بارہ بجے کے قریب سُورج کے ساتھ ہم

بھی نصف النّہار پر تھے۔ بہر حال اب شکایت کا مقام نہ تھا کہ کارزار کے مضافات میں تھے۔ وُہ مقامات جو ان دونوں تاریخ کی زبان پر تھے، ہمارے رستے میں یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ مثلاً العالمین، مرسیٰ مطروح، سیدی بارانی وغیرہ۔ العالمین نے ابھی وُہ شہرت حاصل نہیں کی تھی جو پردۂ تقدیر میں اِس مُقام اور لارڈ منٹگمری کی تاک میں بیٹھی تھی۔

مرسیٰ مطروح پہنچے تو سالِ گزشتہ کی یک طرفہ جنگ کی گئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اِسی مقام پر لارڈ ویول اور اُن کے چوتھے انڈین ڈویژن نے مسولینی کی فوجوں کو مُرغا بنایا تھا۔ جنگ یک طرفہ اِس لیے تھی کہ اِس میں لڑنے کا پارٹ صِرف ہمارے ڈویژن نے ادا کیا تھا۔ مدِّ مخالف یعنی اطالوی سپاہی سٹیج پر آئے تھے، لیکن پھُرتی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، بلکہ کچھ دُور جا کر یک لخت تھم گئے تھے کہ تعاقب کنند گان کا ناحق دَم نہ پھولے۔ اِسی معرکے کے متعلق کسی نامہ نگار نے ہمارے سپاہی کی رائے پوچھی تو اُس نے جواب دیا: ”اچھی ایکسر سائز تھی!“ یعنی یہ اسے نقلی مشق سمجھ رہا تھا جو امن کے زمانے میں کی جاتی ہے۔

اِسی جنگ میں جب اطالوی افسروں کو مورچوں سے نکالا گیا تو ان کے ساتھ ان کی داشتائیں بھی بر آمد ہوئیں۔ اس پر ہمارے ایک پنجابی سپاہی کی غیرت جوش

میں آ گئی اور اُس نے ایک اطالوی کرنل کے ذاتی اسلحے کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے اُسے طعنہ دیا کہ اور نہیں تو اِن "تیویوں"[۲۹] کی خاطر ہی جان پر کھیل جاتے اور پھر اُسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ "چھونی تے پانی پاکے ڈُب مر!"

اور یہ سطور لکھتے ہوئے وُہ مرصّع پستول بھی یاد آتا ہے جو مرسیٰ مطروع میں کیپٹن میاں خاں[۳۰] نے ایک اطالوی بٹالین کمانڈر کے گلے سے اُتار کر ہمارے گلے میں ڈال دیا تھا اور بعد میں اِسی پستول کی بدولت ہم ایک ناکردہ قتل میں ماخوذ ہوتے ہوتے بچ گئے۔ لیکن یہ قِصّہ اپنی جگہ پر!

اِس لمحے اگرچہ مرسیٰ مطروح میں خاموشی تھی! تاہم طیور مطروح سے ایک اُڑتی سی خبر تھی کہ جنگ بہت دُور نہیں۔ سڑک کے کنارے ہر چند قدم پر کسی یونٹ کے نام کا بورڈ تھا یا تیر کا نشان جو صحرا کی وسعت میں کسی چھُپے سپلائی ڈپو یا ورکشاپ کی طرف اشارہ کرتا تھا، مگر سب سے بڑا بورڈ جو نظر آیا، کسی یونٹ کے بارے میں نہ تھا بلکہ مکھیوں کے متعلّق تھا۔ اِس بورڈ پر قدِ آدم

---

۲۹ عورتوں

۳۰ بعد میں لیفٹیننٹ کرنل میاں خاں ایم سی

حروف میں لکھّا تھا: KILL THAT FLY[۳۱] جو سراسر شجاعت کے منافی تھا؛ چنانچہ اسے پڑھ کر ہمارے غازی دِلوں کو ندامت سی محسوس ہوئی کہ آخر مکھّی مارنا کونسی مردانگی ہے، لیکن بعد میں جب اِن صحرائی مکھّیوں سے ہمارے قریبی تعلّقات قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ جنگ میں مگس کشی ایک خاصا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اِس جنگ میں ہمارے سامنے تین دشمن تھے۔ جرمن۔ اطالوی اور مکھّیاں۔ جرمنوں کا معاملہ تو ذرا مختلف تھا لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک اطالوی کی بجائے ایک مکھّی مارنا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ حربی صلاحیت کے اعتبار سے اِن ریگستانی مکھّیوں کا مقام اطالویوں سے کسی قدر بلند تھا اور یہی وجہ تھی کہ وُہ بورڈ لگایا گیا تھا ورنہ ہمیں اِن غیر مُلکی مکھّیوں سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ یہ محض SELF DEFENCE[32] کا تقاضا تھا۔ اگر ہم سے مکھّیاں جیت جاتیں تو ہمارا وقت میدانِ جنگ کی بجائے ہسپتال میں گُزرتا۔ یا شاید ہسپتال سے بھی ذرا آگے!

مطروح سے نکلے، تو سیدی بارانی سے ہوتے ہوئے شام کو سلوم پہنچے۔ یہ مقام مصر اور

---

۳۱ اس مکھّی کو مارو

32 ذاتی حفاظت

لیبیا کی سرحد کے علاوہ امن اور جنگ کی سرحد پر بھی واقع تھا۔ رات وہیں جنگ کی طرف پیٹھ کر کے بحیرہ روم کے کنارے گزار دی اور صُبح درّہ ہلفایہ سے گُزر کر طبرق سے چند میل اِدھر بل حمد کے مقام پر فروکش ہوئے۔ یہ ہمارے کارواں کی آخری منزل تھی، لیکن کوئی بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہماری منزلِ مقصُود بھی تھی۔ کیونکہ اب ہم ریزرو بریگیڈ ہونے کی حیثیت سے میدانِ جنگ کے دروازے پر بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ درونِ خانہ کیا ہو رہا ہے۔

صرف چند میل جنوب میں جرمن فوجیں ہمارے برگیڈوں سے برسرِ پیکار تھیں۔ توپوں کی گھن گرج سے فضا میں ایک ہیبت ناک اور مُستقل سی گُونج تھی جس میں شنوندگانِ گرامی یعنی ہمارے لیے کچھ تواضع کا رنگ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر گولہ ہمارے سَر پر ہی بارِ امانت ہلکا کرے گا۔ چنانچہ پہلی رات گولے شماری میں ہی کٹی۔ دُوسری رات کسی قدر مانوس ہونے لگے، لیکن مانوس ہونے کے بعد بھی ہمارا استعمال تو یہی تھا کہ جونہی ضرورت پڑے ہمیں مقتل میں جھونک دیا جائے۔ سو ہماری دماغی کیفیت وہی تھی جو بقر عید سے پہلے ہر دُور اندیش بکرے کی ہوتی ہے اور بمشکل دو ہفتے گُزرے تھے کہ ہمارے بریگیڈ کی بقر عید آگئی۔ یہ تقریب ہم نے جرمنوں کے ساتھ کسی دھوم

سے منائی، اِس کا ذکر ذرا آگے آئے گا۔

جنگ سے پہلے

طبرق پر برطانوی قبضہ ضرور تھا، لیکن تھا خانہ بدوشوں کا سا۔ کیونکہ نیچے جنوب مغرب سے جرمن فوجیں ہمارے العدم اور نائٹ برج کے مورچوں پر بے حد غیر دوستانہ دباؤ ڈال رہی تھیں اور ہمارا قبضہ بڑی شدّت سے ڈگمگا رہا تھا۔ امکان تھا کہ جرمن کسی لمحے اِن دو مقامات کو روند کر طبرق پر جھپٹ پڑیں گے؛ لٰہذا طبرق میں جہاں ڈٹ کر لڑنے کا سامان کیا گیا تھا وہاں رختِ سفر بھی باندھ رکھا تھا کہ ناچار بھاگنا پڑے تو کھُلے بستر فرار میں حائل نہ ہوں۔ ہمارا بریگیڈ اَب اِس انتظار میں بیٹھا تھا کہ طبرق جانے کا حکم ملتا ہے یا العدم کا۔ اِن دو مقامات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مُشکل تھا۔ ہم جدھر جاتے راہی ملک عدم ہی تھے۔

بَل حمد میں بیٹھے ہوئے جنگ نہ صرف سُنائی دیتی تھی بلکہ رات کو دکھائی بھی دیتی، لیکن دو دِن دیکھنے سُننے کے بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے جنگ نہیں، یونہی پڑوس میں تماشا ہو رہا ہے۔ جی چاہتا کہ یہ تماشا ذرا اور قریب سے دیکھیں؛ چنانچہ حجامت کے بہانے طبرق جا نکلے۔ گویا جرمنوں سے چند قدم ہی ادھر۔۔۔ نائی کی کرسی پر بیٹھے، تو محسوس

ہوا کہ آرائشِ گیسو کے لیے اِس سے بہتر ماحول قاہرہ میں بھی نہ مِلے گا۔ نائی کی دکان کے اندر قینچیاں اور اُسترے چل رہے تھے اور باہر توپیں اور بندوقیں دندنا رہی تھیں۔ اگر یکلخت توپیں اور بندوقیں تھم جاتیں تو قینچی کی لَے ٹوٹ جاتی اور اُسترے کی تال بگڑ جاتی، لیکن جرمنوں کے ہوتے ہوئے ایسے حادثے کا اِمکان نہ تھا؛ چنانچہ ہماری حجامت پورے جنگی اعزاز کے ساتھ ہوتی رہی۔

لیکن اِس اعزاز کے باوجود ہم حجامت کے دوران کانپتے ہی رہے۔ وُہ اس لیے کہ طبرق کے چاروں طرف خاردار تار کی حفاظتی باڑ لگی ہوئی تھی اور بَل حمد سے آتے ہوئے باڑ کے اندر داخل ہونے پر یوں محسوس ہوا تھا کہ محفوظ ہونے کی بجائے محبوس ہو گئے ہیں؛ چنانچہ ہم دِل ہی دِل میں دُعا مانگتے رہے کہ ”الٰہی! اثنائے حجامت میں جرمنوں کو حملے کی توفیق نہ بخشنا۔ لڑائی میں ہارنا اور ہتھیار ڈالنا برحق ہے، لیکن کھُلے میدان میں۔ طبرق کی چار دیواری میں تو ہتھیاروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی ڈالنا پڑے گا۔“ ہماری دُعا قبول ہوئی اور حجامت ختم ہوتے ہی ہم باڑ سے نکلے۔ جیپوں میں بیٹھے اور بَل حمد کی کھُلی فضا میں جا کر دَم لیا۔

خیال تھا کہ اب کسی لمحے لڑائی کا حکم مِلتا ہے، لیکن کئی روز گُزر گئے اور وُہ لمحہ نہ آیا۔ ہم نے سوچا فراغت ہے کل کیوں نہ غسل کر لیں۔ پہلے غسل کو بہت

عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ یہی بیس پچیس روز اُدھر کی بات تھی اور ہر چند کہ جنگ بھی قریب تھی؛ تاہم بحیرہ روم قریب تر تھا اور اس کی گنگناتی، جھِلملاتی موجوں کی صَدا مسلسل دامنِ دِل کھینچ رہی تھی۔ چنانچہ سہ پہر کا وقت تھا کہ یکایک مثلِ آزاد[۳۳]:

یہی جی میں آئی کہ گھر سے نِکل

ٹہلتا ٹہلتا ذرا روم چل!

اور ذرا برعکس آزاد:

وہاں جا کے کپڑے بدن سے اُتار

سمندر کی موجوں پہ تھا مَیں سوار

امابعد بحیرہ روم کے شفاف زمردیں پانی کے گوارا اور گداز لمس نے وُہ آسودگی بخشی کہ پَے در پَے غوطے لگانے شروع کر دیئے۔ اور اپنی ہم غوطہ مچھلیوں کی طرح زیرِ آب تھِرکنے لگے۔ یہ شغل ایک محویت کے عالم میں کچھ عرصے تک جاری رہا۔ آخر سطحِ آب پر آئے اور آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کہ سو دو سو گز درونِ سمندر آ چکے ہیں۔ یعنی اگر بحیرہ

---

۳۳ مولانا محمد حسین آزاد

روم کی شارکوں نے ایک منٹ کے اندر اندر صدقِ دِل سے مہاتما بودھ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرلی تو ہماری خیر نہیں۔ ساحل کی طرف دیکھا تو بے انتشار مُنہ سے نِکلا:

کشتی شکستگل نیم اے بادِ شُرط برخیز!

معاً خیال آیا کہ ہماری جنگ اور حیات تو تمام ہو گئی لیکن پسماندگان کی نظروں میں نہ مُردوں میں ہوں گے نہ زندوں میں بَس MISSING BELIEVED KILLED[34] ہی سمجھے جائیں گے۔ بچنے کا معروف ذریعہ تو ایک ہی تھا کہ بادِ شُرط چل پڑتی اور ہمیں اُڑا کر ساحل تک لے جاتی، لیکن اب کون اُسے شیراز سے لے کر آتا؟ اللہ کا نام لیا اور اپنی محدود پیَراکانہ استعداد کے سہارے ساحل کی طرف تیرنا شروع کیا۔ اِس مُہم میں خُدا جانے ایک ماہ لگا یا ایک سال، تیرتے تیرتے آخر کار ہم ساحل پر وارد ہوئے، لیکن یہ ورود کچھ نیمے دروں نیمے بروں کا سا تھا۔ یعنی ہمارا دھڑ تو سمندر میں ہی تھا، صرف سَر اور بازو ساحل کی ریت تک پہنچ سکے اور وہیں منجمد ہو گئے۔

جب آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں سمندر میں نہانے آئے تھے۔ شام ہونے

---

34 ”لاپتہ ہے غالباً مارا گیا“۔۔۔۔۔ یہ جملہ جنگ میں لاپتہ سپاہیوں کے متعلق اکثر اِستعمال ہوتا ہے۔

کو تھی کہ اُٹھے اور لڑ ھکتے لڑ ھکتے کیمپ میں پہنچے۔ جب خبر عام ہوئی کہ ہم زندہ ہیں تو لوگ ہمیں قُرب و جوار سے دیکھنے آئے۔ چند بد تمیزوں نے ہم سے بحیرہ روم کی دلچسپیوں کے متعلق سوال بھی کیے۔ گویا ہم نے اس لیے جان کی بازی لگائی تھی کہ اِن مسخروں کے ہاتھوں اپنی پریس کانفرنس کرا لیتے؛ چنانچہ ہم نے اکثر سوالوں کے جواب محفوظ رکھے۔

صُبح ہوئی تو وُہ حکم بھی آیا جس کا انتظار تھا۔ یعنی یہ کہ بریگیڈ آگے بڑھ کر سیدی رزیغ کی پہاڑی میں پر دفاعی مورچے قائم کرے اور جرمنوں کے حملے کا منتظر رہے کیونکہ آثار سے پیدا تھا کہ جرمن طبرق کی بجائے سیدی رزیغ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دس دن کے آرام کے بعد بریگیڈ بَل حمد سے اُٹھ کر سیدی رزیغ میں مورچہ گیر ہوا۔ ہماری پیادہ فوج کے دستے پہاڑی کی جنوبی ڈھلان پر۔۔۔یعنی دُشمن کے آمنے سامنے کیل کانٹے بلکہ ذرا زیادہ مُہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ہم ہیڈ کوارٹر والے پہاڑی کی شمالی ڈھلان پر زمین دوز مورچوں میں داخل ہو گئے جہاں باقاعدہ سِگنل آفس کھولا اور ایکسچینج لگایا۔

ایک دن گُزر گیا۔ ایک اور گُزر گیا، لیکن جرمن حملے سے گریز کر رہے تھے۔ ہم مُسلسل دو روز کے امن سے تنگ آ کر غاروں سے نِکلے اور سیدی رزیغ کی وسیع سطح

مرتفع پر مٹر گشت کرنے لگے۔ اس پہاڑی پر پچھلے سال کئی معرکے ہو چکے تھے جن کے نشان بیسیوں بیکار توپوں، سینکڑوں ناکارہ گولوں اور ہزاروں کارگر مگر پوشیدہ بارودی سُرنگوں کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چلتی لاری کا پاؤں نادانستہ طور پر کسی سُرنگ پر آگیا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنے سواروں سمیت خاک و خُون میں بدل گئی۔ سیدی رزیغ کی سطح پر ہر قدم الگ الگ پھُونک پھُونک کر رکھنا پڑتا تھا کہ نیچے کوئی آفت نہ خوابیدہ ہو۔

سیدی رزیغ کی زندگی عام روزمرّہ کی آسائشوں سے یکسر خالی تھی۔ جرمن توپیں کسی وقت ایک سوالیہ گولہ پھینک سکتی تھیں اور پھر نہایت آتشیں مکالمہ شروع ہو جاتا؛ لہٰذا میس کھڑا کرنے کا تکلّف کسی قدر بے جا تھا۔ بس ہر روز ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا، بُلی بیف[۳۵] کا ایک ٹین اور پھل کا ایک ڈبّہ مِل جاتا جو کسی چٹان کی اوٹ میں بیٹھ کر اَن دھوئے ہاتھوں سے کھا لیتے۔ وہاں ہاتھ دھونے کے لوازمات میسّر نہ تھے۔ پانی فقط زبان تَر کرنے کے کام آتا تھا۔ باقاعدہ پانی پینے کا دستور نہ تھا اور ہاتھ مُنہ دھونا تو ایسی عیاشی تھی جسے یاد کرنے کی دلِ حزیں کو اجازت نہ تھی۔

---

۳۵ Bully Beef یعنی بیل کا گوشت

چوبیس گھنٹوں کے لیے پانی کا راشن فقط ایک بوتل تھا اور صحرا میں پیاس کو واجبی طور پر بُجھانے کے لیے بھی ایک واجبی سی جھیل کی ضرورت ہوتی ہے؛ چنانچہ ہم نے کبھی ایک سالم گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اُترتے نہ دیکھا۔ بس بوتل کو مُنہ سے لگاتے اور جونہی زبان کو ایک گرم مرطوب سا احساس ہوتا اُسے زبان سے علیٰحدہ کر دیتے۔ بخدا ہمارا پانی پینا پیاس بُجھانے کے لیے نہ تھا، بلکہ اِس لیے کہ بُلی بیف کے سُست رَو لقموں کا گلے میں 'کیو' نہ لگ جائے۔ پھر ہر کھانے میں خواہ وہ بُلی بیف ہو یا سینڈوچ، ایک مُناسب مقدار صحرائی ریت کی ضرور شامل ہو جاتی۔

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

رہا غسل تو وُہ ماضی قریب کے تجربے کے بعد محض ایک واہمہ تھا۔ ایک سپنا اور سپنا بھی کبھی نہ آنے والا کہ بغیر نیند کے سپنے نہیں آیا کرتے اور سیدی رزیغ میں نیند کہاں؟ جہاں بیٹھ گئے یا لیٹ گئے، بے بستر و بالیں رات گزار دی، سوائے اِس کے کہ کوئی گولہ مُخل نہ ہو۔

تیسرا دن تھا اور جرمن حملے کا نام نہ تھا۔ ہمارے لیے حملے کا انتظار خود حملے سے زیادہ صبر آزما تھا۔ صُبح صُبح ایک چٹان سے لگ کر یکہ و تنہا بے آب و دانہ زندگی سے بیزار بیٹھا تھا

کہ ایک خُدا کا بندہ قریب آتا دکھائی دیا۔ پاس آ کر رُکا اور سلیوٹ کر کے کہنے لگا:

"صاحب، ہمارے صاحب نے آپ کو بُلایا ہے۔"

تنگ تو بیٹھا ہی تھا، جواب دیا:

"جاؤ، تم اپنے صاحب سمیت بہشت میں جا سکتے ہو، سمجھے؟"

غالباً کچھ نہ سمجھا اور چلا گیا، لیکن ایک گھنٹے کے بعد پھر آ نکلا اور بولا:

"صاحب کا اصرار ہے کہ ضرور آؤ۔"

اَب کے ازراہ تفنّن صاحب کا نام پُوچھا تو بولا:

"کیپٹن مظفّر۔"

دِل میں کہا "کوئی ہو گا۔ لیکن کبھی سُنا تھا نہ دیکھا۔" پیامبر سے پُوچھا:

"تمہارے صاحب ہمیں جانتے ہیں؟"

جواب میں کہنے لگا:

"کیپٹن صاحب نے صرف اِتنا کہا ہے کہ سیدی رزیغ میں نیا بریگیڈ آیا ہے۔ اگر اِس میں

کوئی دیسی افسر ہو تو اُسے کہو خُدا کے لیے مُجھے آ کر مِلے۔ مَیں چھ ماہ سے ایک یونٹ لیے اکیلا صحرا میں بیٹھا ہوں اور کسی ہم جنس سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔"

یہ دِل گداز کہانی سُنی تو پیامبر کے ساتھ ہو لیا اور سیدی رزیغ سے کوئی دو میل پیچھے مشرق کو ایک پانیز کمپنی کی لائنوں میں جا داخل ہوا۔ آگے ایک پنجابی کپتان کا کھِلکھلاتا ہوا چہرہ اور کھُلے مہمان نوازی بازو تھے۔ معانقے سے فارغ ہوئے تو بولے:

"تعارف بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے غسل کر لو۔"

سیدی رزیغ میں غسل کی دعوت! گویا کپتان صاحب ایک عام فہم صحرائی مذاق کر رہے تھے۔

عرض کیا:

"پہلے تعارف ہی ہو جائے، تو بہتر ہے۔ غُسل تو اب وطن میں جا کر ہی میسّر ہو گا۔"

جواب میں مظفّر خاموش رہے اور میری بے یقینی کا احترام کرتے ہوئے میرا بازو تھا نے چل پڑے اور آہستہ سے مُجھے ایک خیمے کے اندر دھکیل دیا۔ اندر کیا دیکھتا ہوں کہ پانی سے لبریز ایک ٹب پڑا ہے جو صحرا کے پیاسے کو پہلی نِگاہ پر تالاب نظر آیا۔ دُوسری جانب صاف خشک تولیہ اور صابن رکھّا تھا۔ ادھر ہم تھے کہ کبھی اپنے مُنہ کو اور کبھی

اُن کے گھر کو دیکھتے تھے۔ کپتان صاحب نے ہمارے چہرے کی کیفیت دیکھی تو مُسکرائے اور خیمہ بند کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ اِس کے بعد جو کچھ ہم نے کیا اُسے غُسل نہیں کہنا چاہیے۔ ہمارے تِشنہ وسوختہ جسم نے انگاروں کی طرح پانی جذب کر لیا۔

اس عِشرتِ نایاب سے فارغ ہوئے تو کپتان صاحب کا اردلی ایک تازہ دُھلا ہوا خاکی جوڑا لایا۔۔۔ بتایا گیا کہ ہمارے اپنے کپڑے دُھلنے کے لئے بھیج دیے گئے ہیں، یہ یونیفارم نہ تھی، خاکی رنگ میں عروسی جوڑا تھا؛ پہنا تو محسوس ہوا کہ صحرا میں جنگ لڑنے نہیں آئے، ذرا ہٹلر نے کاک ٹیل پارٹی پر آنے کی زحمت دی ہے۔

اِتنے میں دُوسرے خیمے سے مظفّر کی آواز آئی۔

"اگر نہا چُکے تو جلد آؤ، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

یہ دُوسرا انداق حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ سیدی رزیع میں گرم کھانے کا وجود؟ ناممکن، صحرا میں تو صرف ایک ہی کھانا تھا: بُلی بیف جو ٹین میں سرِ شام ہی چراغ مفلس کی طرح بُجھا سا رہتا تھا لیکن کھانے کے خیمے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں! کیا دیکھتا ہوں!! مُرغِ مسلّم اور بھاپ کے بادل، پلاؤ اور بھاپ کی گھٹائیں اور کیا کیا کچھ۔ میرے دِل نے لگاتار دو تین دھڑکنیں مِس کیں۔ اگر رُک بھی جاتا، تو روا تھا۔ اُس کا ثواب جو ابھی ہم نے کرنا تھا، دِل ہی دِل میں کیپٹن مظفّر کی نذر کیا اور مُرغ کو وہاں پہنچایا جہاں اُس کا خمیر

تھا۔

پھر کپتان صاحب سے باتوں کا دَور شروع ہوا۔ یہ شخص شیریں خصائل ہی نہ تھا، شیریں دہن بھی تھا۔ اس کی باتیں سُنتے سُنتے دو گھنٹے گزر گئے۔ یوں جیسے دو لمحے گُزرے ہوں۔ دلنوازی کا یہ سلیقہ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اگر جنگ سے اُٹھ کر نہ آیا ہوتا تو مظفرؔ[۳۶] کی باتیں سُنتا رہتا، لیکن خیال آیا کہ کہیں طویل غیر حاضری کی وجہ سے بھگوڑا ہی نہ قرار دیا جاؤں، رُخصت چاہی اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر پہنچا۔

شام ہونے والی تھی۔ معلوم ہوا ڈویژن کمانڈر جنرل رِیس (Rees) تشریف لائے ہوئے ہیں اور تقریب یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جرمن مورچوں پر ایک محدود حملہ کیا جانے والا ہے۔ مقصد اِس شب خون کا یہ تھا کہ دشمن کے مزاج اور ارادے کا اندازہ لگایا جائے اور اس غرض کے لیے دُشمن کے کچھ قیدی پکڑے جائیں۔ دُشمن کو مار بھگانا یا اُس کے مورچوں پر قبضہ کرنا مُدعا نہ تھا۔

کوئی گیارہ بجے گھُپ اندھیرے میں ہماری ایک پلٹن آگے بڑھی۔ اِس پلٹن

---

۳۶ بعد میں لیفٹیننٹ مظفرؔ۔ آج کل غالباً کھیوڑے میں رہتے ہیں۔

کے کاروبار اور خیر و عافیت کے متعلّق پیچھے خبریں بھیجنے کے لیے ایک سِگنل کا دستہ ساتھ کر دیا گیا۔ اِس دستے کے پاس دو گاڑیاں تھیں جن میں وائرلیس سیٹ رکھے تھے۔ دستے کے کمانڈر کیپٹن کار تھے جو میرے سینئر تھے۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ سِگنل آفس میں بیٹھ کر وائرلیس سیٹ سے کان لگائے رکھوں اور جونہی کوئی گرم خبر آئے جنرل ریس تک پہنچادوں۔ جنرل موصوف کوئی بیس گز کے فاصلے پر اپنی وین (گاڑی) میں ہمہ تن انتظار تھے، جب گھنٹہ بھر گُزر گیا اور شب خون کی کوئی خبر نہ آئی، تو جنرل صاحب متفکّر ہونے لگے اور صُورتِ حالات معلوم کرنے کے لِیے اپنے اردلی کو میرے پاس بھیجا۔ مَیں نے اردلی کو اطمینان سے جواب دیا کہ NO NEWS[۳۷]

اور خُدا جانے کیا سُوجھی کہ ساتھ اِن الفاظ کا اضافہ بھی کر دیا:

AND NO NEWS IS GOOD NEWS[38]

اردلی کم بخت نے ہمارا پیغام مع ہماری فلاسفی کے جنرل صاحب تک پہنچا دیا۔ ہماری

---

۳۷ کوئی خبر نہیں

38 کسی خبر کا نہ آنا بھی خوش خبری کے برابر ہے۔

فلاسفی بھی ایسی کیا تھی، فوجی حلقوں میں یہ فقرہ اکثر سُننے میں آتا ہے۔ صرف یہ کہ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ ایک جنرل کو اِس بے باکی سے نہیں کہلا بھیجتا۔ تھوڑی دیر کے بعد اردلی پھر نمودار ہوا اور حسبِ توقع ہمیں بتایا کہ جنرل صاحب سلام کہتے ہیں۔ اُٹھا، جنرل صاحب کی وین کے پاس گیا۔ دروازے پر دستک دی اور چہرے پر ایک مصنوعی سکون بلکہ کانپتا کانپتا تبسّم اُوڑھ کر اندر پاؤں رکھا۔ اَب جنرل صاحب کو جو دیکھتا ہوں، تو داغ کے معشوق کی طرح

بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں!

ہمارا سکون اور تبسّم دونوں ایک لطیف سے پسینے میں تحلیل ہو گئے۔

جنرل صاحب بولے:

”جب مُجھے نونیوز کے معنی جاننے کی ضرورت ہو گی تو میں خود پوچھوں گا۔ مگر بغیر پوچھے میں کوئی تشریحات سُننے کا عادی نہیں ہوں۔“

جواب میں یس سر کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا؟ فوج میں یہ ہزاروں جوابوں کا ایک جواب ہوتا ہے۔ اس سے بہتیری بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ لیکن جنرل ریس ایک دُوسری قِسم کی بلا تھے۔ کہنے لگے:

”تو پھر شب خون کی کیا خبر ہے؟“

”سَر کچھ بھی تو نہیں۔ اُس طرف سے کوئی بولتا ہی نہیں۔“

”تُم کیا کر رہے ہو؟“

”سَر کان لگائے بیٹھا ہوں، جو نہی۔۔۔۔“

”تمہاری دو ٹانگیں بھی ہیں؟“

”یس سر۔“

”پھر دوڑو اور خود جا کر خبر لے آؤ۔“

”یس سر۔“

یہ کہہ کر سلیوٹ کیا اور اسی ہاتھ سے واپسی پر ماتھے کا پسینہ پُونچھا۔ وین سے نِکل رہا تھا تو جنرل صاحب نے ایک رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ”ساتھ ایک وائر لیس گاڑی لے جاؤ اور جہاں بھی کچھ نظر آئے مُجھ سے براہِ راست بات کرو، خواہ نو نیوز ہی کیوں نہ ہو۔“ فوج میں ایسی گوشمالی کو راز بری کہتے ہیں اور ہم نے خوب سیر ہو کر نوش کی۔

اَب جنرل صاحب ہمیں سینما میں فلم دیکھنے نہیں بھیج رہے تھے بلکہ دُشمن کے مورچوں

میں اپنی گُم گشتہ بٹالین کی خبر لینے کے لیے۔ اور یہ کوئی معمولی پرائیویٹ سا کام نہ تھا، بلکہ اچھّی خاصی مہلک سی بین الاقوامی مُہم تھی۔ حکم سُنتے ہی ہمیں وُہ ہاتھ یاد آئے جو ہمارے بازو پر امام ضامن باندھا کرتے تھے، لیکن جو ہاتھ ہمارے قریب ترین تھے، نائیک ہرنام سِنگھ کے تھے۔ سو وُہ تسلّی بھی میسّر نہ ہو سکی۔ چنانچہ قہرِ لفٹین بر جانِ لفٹین۔ ایک گاڑی لی۔ اس میں وائرلیس سیٹ پہلے ہی سے نصب تھا۔ دو تین آدمی بھی ساتھ لیے اور گاڑی نصیبِ دُشمناں، سوئے دُشمناں روانہ ہوئی۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی اور باڑ کے دونوں طرف بارودی سُرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوئی اِنسان یا گاڑی سڑک سے ذرا بھٹکی اور تار میں اُلجھی۔ سُرنگ پر پاؤں آیا اور ایکا ایکی سُرنگ پھٹی، پھر ایک آن میں تار اور تار میں پھنسنے والوں کا قِصّہ پاک ہو گیا۔ ہمارا قِصّہ پاک ہونے کے امکانات اور زیادہ روشن تھے کہ ہم اندھیری رات میں بتّیاں جلائے بغیر سفر کر رہے تھے اور سڑک کے کنارے ہمیں نظر نہیں آتے تھے۔ یوں سمجھیں کہ ریل کی سُرنگ میں سے ہوائی جہاز اُڑا کر لے جا رہے تھے ذرا دائیں یا بائیں چھُو گیا اور قِصّہ پاک!

چلتے چلتے کوئی دو میل گئے ہوں گے کہ سامنے ایک ساکن گاڑی کی پُشت دکھائی دی۔ "یا خُدا! یہ دُشمن تو نہیں؟" ذرا پسینہ چھُوٹا، لیکن پیشتر اِس کے کہ دریا بہنا شروع ہوتا، ہمارا ڈرائیور ہنسا اور بولا:

"جی ایہہ تاں بھگت سنگھ دی گڈّی اے۔"

بلکہ غور سے دیکھا تو گاڑیاں تھیں اور وہی وائرلیس کی گاڑیاں جن کی بھیجی ہوئی خبروں کے لیے جنرل ریس گوش بر آواز یا فی الحال گوش بَر ہوا تھے۔ گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے اِس پسماندگی کی وجہ پوچھی تو بولے: "کپتان صاحب بچھڑ گئے ہیں صاحب آگے آگے جیپ میں جا رہے تھے، پھر یک لخت غائب ہو گئے۔"

اِس مقام سے آگے چار پانچ میل تک NO MANS LAND تھا اور ہماری بٹالین یہ فاصلہ عُبور کر کے اُس وقت دُشمن سے دست و گریباں تھی۔ گولوں اور گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن صحرا کی وُسعت میں ان کی سمت یا مُقام کا اندازہ کرنا مُشکل تھا۔ اب نو نیوز کی وجہ تو معلوم ہو گئی تھی لیکن حیران تھا کہ جنرل ریس کو کیا خبر بھیجوں۔ اگر سچ بولتا تو ایک انگریزی محاورے کے مطابق جنرل ریس بہ نفسِ نفیس ایک بچّہ جن دیتے جو ایک جنرل کے لیے بھی خاصا جوکھوں کا کام ہے۔ دروغ کا مقام نہ تھا کہ سینکڑوں جوانوں کی موت اور زندگی کا سوال تھا۔

اِسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آ کر رُکی۔ یہ کیپٹن کارتھے۔ ہانپتے کانپتے بلکہ روتے دھوتے! ہوا یہ تھا کہ کیپٹن صاحب جاتے وقت پُورے سات میل پیچھے دیکھے بغیر نِکل گئے۔ جب دُشمن سے ٹکر ہوئی اور جنرل صاحب کو کامیابی کی خبر بھیجنے کی

ضرورت محسوس ہوئی تو وائرلیس گاڑی کو آواز دی۔ ”کوئی ہے؟“ گویا کلب میں بیرے کو بُلا رہے ہوں۔ گاڑی کی تلاش میں نکلے تو پانچ میل پیچھے آنا پڑا اور اب سانس اِس لیے پھُول رہا تھا کہ پیچھے جنرل ریس دکھائی دے رہا تھا۔

جب مُجھ سے کہانی سُنی تو سنّاٹے میں آ گئے۔ مَیں نے مشورہ دیا کہ خبر بہرحال کامیابی کی ہے، خود ہی جنرل صاحب کو سنائیں۔ کیپٹن کار نے مائیک ہاتھ میں لیا اور جنرل صاحب سے ابتدائے کلام کی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کپتان صاحب پر بتدریج ایک غش غالب آ رہا ہے۔ اِس غش کے پیچھے جنرل صاحب کا ہاتھ بلکہ زبان کار فرما تھی۔ بہرحال یہ برداشت کرنے کے بعد کیپٹن کار نے کامیابی کی خبر سُنائی اور پھر ہم نے اُن کے چہرہ پر قطرہ قطرہ رونق آتے دیکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ رونق بھی جنرل صاحب کا عطیہ تھا۔

صُبح جب بٹالین واپس آئی، تو اپنے ساتھ چند اطالوی اور جرمن قیدی بھی لائی۔ جنرل صاحب نے تمام افسروں کو شاباش دی۔ لائن کے آخر میں ہم بھی کھڑے تھے۔ ہم سے ہاتھ ملایا تو مُسکرائے دیے اور دُوسروں کو سُنا کر کہا:

”رات ہم دونوں نے بھی ایک چھوٹی سی جنگ لڑی تھی“

اِس واقعہ کے بعد جرمنوں نے ہمیں ذرا زیادہ توجہ کا مستحق سمجھا بلکہ دو ہی دِن بعد ہمیں اِس قدر توجہ دی کہ ہمارے بریگیڈ میں سے جو بچ رہے، انہیں جرمنوں کی کم التفاتی کی

کبھی شکایت نہ ہو گی۔

روزِ جنگ

۱۷جون ۱۹۴۲ء کی صُبح طلوع ہوئی تو اُس میں افریقہ کے صحرا اور سیدی رزیغ کی پہاڑی کے لیے کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن سیدی رزیغ کے مورچہ بندوں کے لیے یہ صُبح بڑی خاص تھی کہ آج اُن کی مَوت اور زندگی کا سوال زیرِ بحث آنا تھا۔ لیکن ذرا پچھلے پہر سرِ دست مشرق سے سُورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ بارود جامد صحرا بتدریج ایک تپتے جھُلستے آوے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیدی رزیغ کے غاروں سے ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے افسر اور عہدیدار رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر باہر نکلتے تو اپنی برساتیوں سے جو رات کو شبنم کے قطرے جمع کرنے کے لیے بچھا رکھتے تھے، چُلّو بھر پانی جمع کرتے ۔۔۔ڈوب مرنے کے لیے نہیں شیو کرنے کے لیے۔۔۔ یہ شبنم ہم

صحرا نوردوں کے لیے من و سلویٰ سے کم نہ تھی۔ ورنہ ہمارے پانی کے راشن پر حجامت کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میں سے کئی ایک نے اپنی داڑھیوں کی بے پناہ یلغار کے آگے اُسترے ڈال دیے تھے اور اچھّے خاصے آرچ بِشپ نظر آتے تھے۔

ہمارے زمین دوز سِگنل آفس سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی کوئی ڈی۔ آر (یعنی چِٹھّی رساں) تیز تیز نِکلتا اور موٹر سائیکل سنبھال کر ہوا ہو جاتا۔ کبھی اگلے دستوں کے ساتھ ٹیلی فون کی لائن کٹ جاتی تو فی الفور پانچ چھ جوان پہلے سے تیار کھڑی لاری میں پھٹتے گولوں اور بھڑکتی سُرنگوں سے بے پروا لائن کی مرمّت کو چل نکلتے۔

دُشمن کے مُقابلے میں ہماری تین پلٹنیں تھیں۔ گڑھوال رائفلز، راجپوت رائفلز اور ساؤتھ ویلز بارڈرز۔ علاوہ ازیں پہاڑی کمین گاہوں میں جابجا ہمارے توپخانے نے توپیں نصب کر رکھّی تھیں۔ اپنے مورچوں کے سامنے ہم نے بارودی سُرنگوں اور خاردار تاروں کا جال بھی بچھا رکھا تھا کہ دُشمن کو ہمارا مورچہ حاصل کرنے کے لیے ذرا دامن سنبھال کر اور جان کی بازی لگا کر آگے ہونا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ بغیر بازی لگائے ٹہلتے ٹہلتے سیدی رزیع کی بلندی پر آدھمکے اور ہمیں مزاج پُرسی کا موقع ہی نہ دے۔ ہماری سُرنگوں سے آگے چند میل بے مالک زمین تھی اور اُس پار فیلڈ مارشل رومل کی افواج

اور اُس کے بکتر بند ڈویژن تھے۔

فریقین کو ایک دُوسرے کی موجودگی کا نہ صرف عِلم تھا بلکہ کئی روز سے دور مار توپوں کے ذریعے ایک دُوسرے سے علیک سلیک بھی کر رہے تھے۔ فرق صِرف اِتنا تھا کہ قرائن سے آج جرمنوں کی نیت میں معمول سے زیادہ فتور نظر آتا تھا۔ یعنی یوں جیسے حملہ کرنے والے ہوں۔ ویسے ہماری نیت کا بھی اللہ ہی مالک تھا، لیکن آج ہمیں فقط مدافعت ہی کی توفیق تھی۔ اگرچہ اِس مدافعت کے یہ معنی نہ تھے کہ ہم جرمنوں کے خلاف محض پکٹنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ جی نہیں، ہمارے جنرل سٹاف کو گاندھی جی سے نیاز حاصل نہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں تو خاصے ظالم پتھرّ تھے۔ فقط یہ کہ جنگی ضرورت کے تحت اُن کا اِستعمال صرف اُسی صورت میں کرنا تھا کہ جرمن پہلے اینٹ پھینکیں۔ اور یہ اینٹ بالآخر پچھلے پہر نازل ہوئی۔

مَیں بریگیڈ سِگنل آفس میں بیٹھا تھا۔۔۔ یہ آفس ایک گہرے غار میں تھا۔۔۔ کہ اچانک ہمارے ہراول دستوں نے وائرلیس پر جرمن حملے کی خبر دی۔ حسبِ معمول حملے کی ابتدا شدید گولہ باری سے ہوئی۔ جواب میں ہماری توپوں نے بھی ماحضر پیش کیا۔ جب یہ باہمی تواضع ذرا زور پکڑ گئی؛ تو مختلف یونٹوں سے جنگی حالت کے متعلّق ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعے پیغام آنے لگے۔ دو چار ہی پیغام پڑھے تو محسوس ہوا کہ کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں۔ مُجھے وُہ لمحہ کبھی نہ بھُولے گا جب

وائرلیس پر ہمارے بریگیڈ کے پہلے جوان کے مرنے کی خبر آئی۔ یہ ہمارے توپ خانے کا ایک گولہ انداز تھا۔

جنگ کے دوران عموماً وائرلیس پر خُفیہ زبان یعنی سائیفر یا کوڈ میں پیغامات بھیجے جاتے ہیں جو بعض اوقات محض اعداد کی شکل اِختیار کر لیتے ہیں کہ دُشمن بات نہ سمجھ لے، لیکن جب لڑائی کا یہ عالم ہو کہ دست و گریبان کا مُعاملہ ہو تو پوشیدگی کا تکلّف برطرف رکھ دیا جاتا ہے اور صاف سُتھری انگریزی میں اِطلّاعات اور احکامات آنا جانا شروع ہو جاتے ہیں؛ چنانچہ لحظہ بہ لحظہ جنگی حالت کی خبریں آتیں کہ دُشمن کے ٹینک اِس پہلو سے بڑھ رہے ہیں یا فلاں مقام پر توپ کا فائر تیز ہو گیا ہے یا ہمارے اتنے آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ کمک کی فلاں جگہ ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اطلاعات خفیہ زبان کی بجائے ننگی انگریزی میں وائرلیس پر آتیں۔

لیکن ایک مرتبہ ہمارے ایک یونٹ کمانڈر کو جنگی چال کے سلسلہ میں نہایت راز کی بات کہنا تھی اور فی الفور کوڈ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صاف انگریزی میں بات کرتا تو قیامت ٹوٹ پڑتی۔ لہٰذا اپنی گوراشاہی اُردو میں بولنے لگا جسے ایک گورا ہی سمجھ سکتا تھا اور جو جرمنوں کے فہم سے بہت بالا تھی۔ اِدھر ہمارے بریگیڈ کمانڈر نے بھی اُردو میں جواب دیا اور عارضی طور پر یہ داؤ چل گیا۔ ہم نے یہ قِصّہ سُنا تو سینہ فخر سے تن گیا اور کئی دِن تنا رہا۔

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(اگرچہ یہاں اُردُو دھوم مچانے کے لیے نہیں، دُھول ڈالنے کے لیے استعمال کی گئی)

ہمارا بریگیڈ پہلی مرتبہ جنگ لڑ رہا تھا۔ دُشمن کی دُورمار توپوں کے گولے ہمارے سَروں کے اُوپر سے گُزر رہے تھے اور ایسا کرنے میں ہمیں زندگی بھر کے لیے ممنون کر رہے تھے۔ کیونکہ وُہ دراصل ہمارے اِستفادے کے لیے ہی پھینکے جارہے تھے اور اگر سر سے گُزرنے کی بجائے وہیں نازل ہو جاتے تو ہم نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ متوفّی بھی۔ ویسے اِن گولوں کو ہم تک پہنچنے کے لیے غار کی چھت چیرنا پڑتی اور اتنی زحمت کے بعد اُنہیں ہم تک رسائی ہو جاتی تو مرنا عار بھی نہ تھا۔ یہ بھی اطمینان تھا کہ اکیلے نہ مریں گے۔ بہت سے یارانِ غار کی رفاقت حاصل تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِس غار کی گہرائی میں ہم بے حد محفوظ تھے۔

ہمیں رہ رہ کر اُن جوانوں کا خیال آتا جو کھُلے میدان میں ہم سے دو میل آگے توپوں اور مشین گنوں کی زد میں بیٹھے تھے۔ ان کی سپر یہ فلاسفی تھی کہ اگر اِس گولے پر ہمارا نام نہیں لِکھا تو ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور اگر لکھا ہے تو چھُپنے کا فائدہ نہیں۔ یہ ہے بہادروں کی فلاسفی۔ لیکن اِس فلسفے کا ذکر کرنا آسان ہے، اِس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ یارانِ غار تقریباً سب کے سب ذاکر تھے۔ عامل آگے تھے۔ اِدھر رات بھر دُشمن

گولے برساتا رہا، لیکن اپنے مورچوں سے نِکل کر ہماری طرف نہ بڑھا۔ ہماری افواج تو خیر تھیں ہی دفاعی مورچوں میں اور دُشمن کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہمارا ارادہ تھا نہ اِمکان۔

امن کے زمانے میں اس لَق و دق صحرا کی راتیں کس قدر خاموش اور بے ہنگامہ ہوتی ہوں گی، جہاں سینکڑوں میلوں تک کہیں آبادی کا نام نہ تھا۔ جہاں سیدی رزیغ، الدودہ، العدم وغیرہ محض بے جان ٹیلوں یا گھاٹیوں کے نام تھے۔ لیکن اَب اس مُردہ ریگستان کی تمام تر پہنائی رنگ[۳۹] و صَوت[۴۰] کے وحشت خیز ہنگاموں سے بھرپور تھی۔ یہ رات تقریباً ساری کی ساری آنکھوں میں کٹی۔ لیٹنے کو ایک پَل بھی نہ مِلا اور مِلتا بھی تو اسے لیٹ کر گُزارنے میں کچھ خُوبی نہ تھی کہ اِن حالات میں سخن گُسترانہ بات نیند نہ تھی بلکہ خُود زندگی تھی اور زندگی بیداری اور حرکت سے عبارت ہے۔ اگر سو جاتے تو شاید سحر ہی نہ

---

۳۹ رنگ: وُہ روشنی کے سُرخ و سپید گولے جو ہر دو جانب سے مخالف افواج کو دیکھنے یا اپنی افواج کو اِشارہ کرنے کی غرض سے چھوڑے جاتے اور وُہ سرچ لائٹ کی لمبی روشن اُنگلیاں جو آسمانوں کی وسعتوں کو چیرتی ہوئی مخالف طیاروں کا تعاقب کرتیں۔

۴۰ صَوت: وُہ توپوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ جو کبھی اِس قدر دُور کہ خواب معلوم ہوتا اور کبھی اِس قدر قریب کہ ٹیلے کی اوٹ لینے کو جی چاہتا۔

ہوتی۔

صُبح ہوئی، تو جنگ بدستور جاری تھی۔ لیکن نہ دُشمن آگے بڑھا تھا اور نہ ہم ہی نے مورچے خالی کیے تھے۔ ہمارا جانی نقصان بھی ہلکا سا تھا لیکن جو کھٹکا ہمیں مسلسل لگا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ سیدی رزیغ کے جنوب میں سینکڑوں میل تک صحرا ہی صحرا تھا اور ہمیں ڈر تھا کہ دشمن کہیں ہم سے آنکھ بچا کر دُور جنوب سے بڑھ کر مشرق میں ہماری پسپائی کا راستہ نہ کاٹ دے۔ لیکن ہماری سادگی دیکھیں کہ ہم اس ناگوار اِمکان کا محض ذکر ہی کرتے رہے اور جرمنوں نے اِس پر عمل بھی کر دیا، یعنی تمام دِن اِن کی توپوں نے ہمیں جیسے باتوں میں لگائے رکھا اور چُپکے سے اُن کا مشہور ۹۰ لائٹ آرمرڈ ڈویژن بہت دُور جنوب سے ایک قوس کی شکل میں مشرق کو ہمارے مقدم کے لیے بڑھنے لگا۔ کوئی غروبِ آفتاب کا وقت تھا کہ ہماری ہائی کمان پر جرمن چال کا انکشاف ہوا اور فوراً ہمارے بریگیڈ کو سیدی رزیغ چھوڑ کر سلوم کی طرف پسپائی کا حکم ملا۔

اَب پسپائی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جونہی حکم مِلا، ہر سپاہی اور افسر نے سَر پر پاؤں رکھ کر پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ پسپائی ایک نہایت ہی دقیق جنگی چال ہے۔ اِس میں ہر یونٹ ہر سیکشن بلکہ ہر جوان کو ایک سوچے سمجھے منصُوبے کے تحت ایک خاص وقت پر اپنی جگہ چھوڑنی ہوتی ہے اور وُہ اِس طرح کہ کسی دُوسری طرف سے دُشمن پر گولہ باری شروع

کر دی جاتی ہے کہ وُہ پسپا ہونے والے یونٹ کو جگہ خالی کرتے دیکھ کر اُس پر پل نہ پڑے۔ اپنے اور دُشمن کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھّا جاتا ہے اور مختلف یونٹ ایک دُوسرے کو حفاظتی فائر دے کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ اِس طرح مکمّل بریگیڈ کو پوزیشن خالی کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔

سُورج غروب ہو رہا تھا کہ ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے۔۔۔ جس میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔۔۔ پسپائی کی ابتدا کی۔ کوئی دس بارہ گاڑیوں کا ہلکا پھُلکا سا کانوائے تھا۔ اِدھر ساحلی سڑک پُختہ بھی تھی اور سیدھی بھی۔ اور ہماری فلاح کا تقاضا تھا کہ اِس صراطِ مستقیم پر جس تیزی سے بھاگ سکیں، بھاگیں۔ چنانچہ بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگتے ہوئے ہمارے شمال میں بحیرۂ قُلزم تھا اور جنوب میں جرمن۔ قُلزم سے تو ہمیں ایسی دلچسپی نہ تھی، لیکن جرمنوں سے ہمارا بہت سا مفاد وابستہ تھا؛ چنانچہ ہماری آنکھیں اُن کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ دفعتہً جنوب میں ہمیں روشنی نظر آئی اور ہماری دُنیا تاریک ہو گئی، کیونکہ یہ روشنی اُن گولوں کی تھی جنھیں جرمن دستے فضا میں بُلند کرتے ہوئے ہماری پیشوائی کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ تیزی میں آکر ہمارا ایک ٹرک صراطِ مستقیم سے بھٹک کر ریت میں پھنس گیا۔ ہمیں گمراہ ٹرک کو راہ راست پر لانے کی فُرصت نہ تھی۔ اسے

وہیں رہنے دیا اور سواریوں کو دُوسری گاڑی میں بٹھا کر فرار جاری رکھا اور آخر دُشمن کے پنجوں سے اِنچوں کے حساب سے بچ نکلے۔

اب بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے تو فلاح پالی تھی، لیکن خود بریگیڈ کا کیا حشر ہونے والا تھا؟ اور وہ محض چند ہلکی پھُلکی گاڑیوں کا کانوائے نہ تھا بلکہ سینکڑوں بھاری بھرکم لاریوں کا کارواں تھا جو تین ہزار جوان اور قیمتی اسلحہ لے کر تنگ صحرائی سڑک پر رینگتا رینگتا چلا آرہا تھا اور جس کے اِستقبال کو جرمن توپیں دہانے کھولے کھڑی تھیں۔۔۔ دِل ہزار وسوسوں کی آماجگاہ تھا۔ "یا اللہ ہمارے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ کھُلی لاریوں میں بیٹھے وُہ کوئی مدافعت بھی تو نہ کر سکیں گے۔ کیا وُہ سارے مُوت کے مُنہ میں آرہے ہیں؟"

ہم رات بھر جاگتے اور بھاگتے رہے۔ کوئی تین بجے شب کا عمل تھا کہ اچانک ہمیں سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے قریب اوٹ میں آگ جل رہی تھی جس پر چائے کی کیتلی رکھی تھی اور تین چار جوان آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم نے گاڑی ٹھہرالی۔ انجن کا شور بند ہوا تو اچانک ماہیے کی ایک سُریلی آواز کان میں پڑی:

"پِنڈیوں آئی لاری۔ مَیں تینوں ہوڑ رہیاں، پردیس نہ لائیں یاری۔"

جس پردیس اور جس بریگیڈ میں ہم تھے، اُس میں یاری لگانے کے اِمکانات تو ایسے روشن نہ تھے، لیکن ماہیے کی آواز سُن کر دِلِ حزیں نے پہلو بدلا۔ یوں محسوس ہوا جیسے

چکوال آنکلے ہوں۔ اِن جوانوں کی بے پناہ SENSE OF HUMOUR (حسِّ ظرافت) پر تعجب ہوا کہ جہاں دُوسرے لوگ جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں، یہ مَن چلے پردیس کی یاری کے گیت گا رہے ہیں۔ ہمیں رُکتا دیکھ کر ایک جوان آگے بڑھا اور بولا:

"صاحب چائے پیو گے؟"

ہم رات بھر کے بھُوکے پیاسے بھاگ رہے تھے اور پھر اس پیار سے پیش کی ہوئی چائے سے اِنکار کس کافر کو ہوتا؟ ایک پیالی پی تو شکست کا غم کم ہو گیا۔ چلتے ہوئے خالص دھنی[41] کے لہجے میں خدا حافظ کہا تو آواز آئی کہ صاحب تو گِرائیں[42] معلوم ہوتا ہے۔ جی تو چاہا کہ دو گھڑی اِن دو عالم سے بیگانہ بہادروں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں لیکن کارواں کے آداب مانع تھے۔

صُبح دم سلوم پہنچے اور بے تابی سے اپنے ساتھیوں کی آمد کا اِنتظار کرنے لگے۔ اِدھر میس کے عملے نے فوراً بارگاہ کھڑی کی۔ یعنی میس کے خیمے نصب کیے اور میز پر ناشتہ چُنا۔ بریگیڈ کمانڈر صاحب مع دُوسرے افسروں کے کھانے پر آ بیٹھے۔ مُجھ پر نِگاہ پڑی تو

---

۴۱ چکوال اور اِس کے اِرد گرد کا علاقہ دَھنی کہلاتا ہے۔

۴۲ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے۔

ارشاد ہوا کہ ''دیکھو بریگیڈ کے باقی یونٹ آنے والے ہیں۔ تُم جلد جلد ناشتہ کرلو اور اِن یونٹوں کے آنے سے پہلے ہی اِن کی لائنوں تک ٹیلی فون لگوانے کا انتظام کرو۔ تا کہ فی الفور سلسلۂ مواصلات شروع ہو سکے اور مُجھے نقشے پر اِن یونٹوں کی جائے قیام دکھائی۔

مَیں نے چائے کی پیالی پی اور جلد جلد ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں گیا کہ پندرہ بیس میل تار حاصِل کروں۔ ہمارے اپنے بریگیڈ کے تار تو سیدی رزیغ کی گھاٹیوں میں ہی بکھرے رہ گئے تھے۔ عام فوجی مشقوں میں کوچ سے پہلے تار لپیٹ لیا جاتا ہے تا کہ دوبارہ اِستعمال ہو سکے، لیکن گزشتہ شب کے کوچ میں ہم بمشکل اپنے آپ کو لپیٹ سکے تھے اور ہمارے ٹیلی فونوں اور تاروں نے ہر چند کہ لمبے ہاتھ کرکے فریاد کی تھی کہ ہمیں بھی ساتھ لے جایئے، لیکن ہم مُڑ کر ان پر حسرت کی نگاہ بھی نہ ڈال سکے تھے کہ ہمارا کوچ سراسر رضاکارانہ نہ تھا، اِس میں جرمنوں کی طرف سے کچھ شائبۂ جبر بھی تھا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر سے تار مانگا تو جواب ملا:

''کیا کروکے تار کو؟''

عرض کیا: ''پیچھے سے تین بٹالین اور توپ خانہ آرہے ہیں۔ ان کے اور بریگیڈ کے درمیان ٹیلیفون لگانا ہے؟''

ارشاد ہوا: ”تم نے خبر نہیں سُنی؟“

اندازِ سوال سے ظاہر تھا کہ خبر اچھّی نہیں۔ تفصیل پُوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ خُدا جانے ہمارے ساتھیوں پر کیا گُزری تھی۔ بیم و رجا کے عالم میں اس کا مُنہ تکنے لگا۔ میری دماغی کیفیت غالب کے قیدی پرندے سے مختلف نہ تھی جس نے نو گرفتار ساتھی سے رودادِ چمن پُوچھتے ہوئے اپنے آپ کو جھوٹی تسلّی دی تھی کہ ِگری ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو۔

اور جب رودادِ چمن سُنی تو معلوم ہوا کہ سچ مُچ ہی بجلی اپنے آشیاں پر ہی ِگری تھی۔ تفصیل سُن کر سکتے میں آ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ ہمارے بچ نکلنے کے بعد دُشمن نے سڑک پر ایک روڈ بلاک لگا لیا اور تمام تر اسلحہ سے لیس ہو کر ہمارے بریگیڈ کا انتظار کرنے لگا اور جونہی ہمارے لاری سوار جوان قریب آئے۔ کم بخت نے گزوں کے فاصلے سے اُن پر گولہ اور بارود کی بارش کر دی۔ بیشمار سپاہی لاریوں کے اندر مارے گئے۔ جو نیچے اُترے وہیں ڈھیر کر دیے گئے۔ فرداً فرداً یہاں بھی ہمارے جوانوں نے بہادری کا ثبوت دیا۔ ایک جوان کو ٹامی گن سے جرمن ٹینک پر حملہ کرتے دیکھا گیا۔ کئی ایک سنگینیں تان کر جرمن مشین گنوں پر ِپل پڑے، لیکن یہ جوش دُشمن کو مارنے کے لیے نہیں تھا، ِصرف عزّت سے مرنے کے لیے تھا۔ تقریباً نصف سے زیادہ بریگیڈ تباہ ہو گیا۔ سینکڑوں جوان مارے گئے یا قید کر لیے گئے۔

اِس شکست کا بدلہ آخر ہمارے چوتھے ڈویژن نے لیا جس نے آٹھویں فوج کی یلغار میں جنرل منٹگمری کی قیادت میں حِصّہ لیا۔ لیکن جنگ کی درشتی کا صحیح احساس فتح میں نہیں شکست میں ہوتا ہے اور ہمارا جنگ کا پہلا تجربہ ایک مکمّل شکست اور طویل پسپائی تھی جو فوجی نقطۂ نگاہ سے ایک ناقابلِ فراموش اور قیمتی سبق تھا۔

مَیں نہ اچھّا ہوا، بُرا نہ ہوا

پسپائی بسوئے مینا کیمپ

اب سلوم میں ٹھہرنا بے معنی تھا۔ جنرل ہیڈ کوارٹر قاہرہ سے حکم تھا کہ چار پانچ روز میں بریگیڈ کے پسماندگان اکٹھے ہو لیں تو نہر سویز کے قریب ایک بیس کیمپ (BASE CAMP) میں بھیجے جائیں اور وہاں انہیں توڑ پھوڑ کر اور مزید کمک شامل کر کے ایک نیا بریگیڈ کھڑا کیا جائے۔ خود ہمیں تو توڑنے پھوڑنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم پہلے ہی خاصے کوبیدہ و بالیدہ تھے۔ سیدی رزلیغ کے دِنوں میں جرمن حملے کے ساتھ خود ہمارے گلے نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ گلے کی تکلیف خاصی تھی لیکن صرف ٹنسلائٹس ہی تھا جو جرمنائٹس کے مقابلے میں گُدگُدی معلوم ہوتا تھا۔ اب جرمنوں سے تو سلوم میں امان مل گئی تھی، لیکن اپنے گلے سے گلو خلاصی کے لیے ہسپتال درکار تھا۔ ہرچند کہ ہمارے بریگیڈ میں ایک فیلڈ ایمبولینس اور اُس کے ڈاکٹر بھی تھے جو ہمارے قریب ہی خیمہ زن تھے اور میں اوّلین فرصت میں اُن کے پاس گیا بھی لیکن

دیکھا تو ڈاکٹر لوگ سیدی رزیغ کی شکست کے بعد اپنے جگر کے چاک ہی رفو نہ کر پائے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کی حالت دیکھ کر یہ خاکسار اپنے گلے کا دُکھ بھُول گیا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وُہ ہم سے بھی زیادہ کُشتہ تیغِ سِتم نکلے

ہمارے گلے کے علاج کے لیے قریب ترین ہسپتال بصیلی تھا جو اسکندریہ کی بغل میں بحیرۂ روم کے کنارے واقع تھا، یعنی کوئی تین سو میل پیچھے مشرق کو؛ چنانچہ ہمیں حکم مِلا کہ جس قدر جلد ہو سکے، بصیلی کے ہسپتال میں پہنچو۔

اَب سلوم اور بصیلی کے درمیان کوئی بس تو چلتی نہ تھی کہ ٹکٹ لے کر بیٹھ جاتا۔ جنگ میں مقام الف سے مقام ب تک جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی HITCH HIKE[43] اپنا مُختصر سامان لے کر جو ایک فوجی تھیلے پر مشتمل تھا، سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور مشرق کی طرف جاتے ہوئے پہلے ٹرک کو ہاتھ دیا۔ یہ صحرائی جنگ کے آداب میں سے تھا کہ کوئی سپاہی سواری کا محتاج ہو تو

43 اِس انگریزی ترکیب کا غالباً کوئی ترجمہ نہیں۔ اگر آپ نے انگریزی نہیں پڑھی تو کوئی ہرج نہیں۔ پڑھتے جایئے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔

اُسے شناخت کے بعد بلا تاّمل جگہ دی جائے۔ ہم نے ڈرائیور کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ٹرک کو صرف مرسیٰ مطروح تک ہی جانا تھا۔ اس مشہور صحرائی چھاؤنی میں پہنچے تو دیکھ کر حیرت بلکہ عِبرت آنے لگی۔ شکست واقعی نامُراد شے ہے۔ مرسیٰ مطروح ہم نے جاتی مرتبہ بھی دیکھا تھا۔ کیا چہل پہل تھی؛ وُہ آباد یونٹ، وُہ شاداب میس، وُہ آسودہ چہرے اور وُہ بیہودہ گپیں۔ مرسیٰ مطروح زمانۂ امن میں ایک اطالوی چھاؤنی تھی، قد کے لحاظ سے چھوٹی سی، مگر آسائشیں بڑی بڑی میسّر تھیں۔ اطالوی افسروں اور سپاہیوں کے متعلّق مشہور تھا کہ جنگ کے علاوہ ہر فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ اُن کے دیگر کمالات کی پڑتال کا تو ہمارے پاس وقت نہ تھا لیکن فنِ تعمیر میں انہیں واقعی یکتا پایا۔ کم بختوں نے صحرا کو بہشت میں بدل دیا تھا۔ مرسیٰ مطروح کو تو جانے دیں کہ زمانۂ امن کی پیداوار تھا۔ عین جنگ اور عین صحرا میں بھی یہ خوش مذاق اطالوی اپنے مورچے اِس نفاست سے کھودتے تھے گویا تاج محل تعمیر کر رہے ہوں اور اطالوی افسروں کے لوازماتِ زندگی کے پیشِ نظر شاید محلّات کی ضرورت بھی تھی۔ یہ پچھلے سال کی تو بات تھی کہ جب ہمارے جوانوں نے اطالوی مورچوں کو جادبوچا تو اندر سے جہاں پر اطالوی افسر ہاتھ بلند کیے باہر نِکلا وہاں ساتھ ہی ایک جوان لڑکی بھی ہاتھ کمر پر رکھّے برآمد ہوئی۔ غنیمت کے اِس مالِ لطیف نے شروع میں تو کچھ عجیب مسائل پیدا کر دیے کہ

ہماری فیلڈ بُک میں اِس موضوع پر کوئی ہدایت نہ تھیں، لیکن جلد ہی ہمارے کمانڈر کے حُسنِ مذاق نے اِس کا واحد تسلّی بخش حل ڈھونڈ نکالا۔

ذکر مرسیٰ مطروح کی بے رونقی کا تھا۔ صِرف چند ہفتے پہلے مطروح کا ہر گوشہ کفِ گُل فروش تھا، مگر اب کہ ہر لحظہ رومل کے حملے کا ڈر تھا، اِس کے گلی کوچوں میں ہر چند قدم پر خاردار تار کے دیو قامت گولے لڑھکا دیئے گئے تھے جن سے دست و پا ہی نہیں، دیدہ و دِل بھی مجروح ہوتے تھے۔ پسپائی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور جنگ میں پسپائی سے زیادہ یاس انگیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محافظینِ مطروح بے حد مضمحل نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں رات کو میٹھی نیند یا سُہانے خوابوں کی توقع بیکار تھی؛ چنانچہ جوں تُوں کر کے مرسیٰ مطروح میں ایک افسردہ سی رات گزاری۔ دُوسرے دن علی الصُبح بستر باندھا اور اِس حسرت کدے سے نکل کر لاریوں کے رہگزر پر آ بیٹھے اور کافی دیر بیٹھا کیے۔ اٹھائے جانے کا تو خوف نہ تھا کہ کوسوں تک دَیر تھا نہ حرم، دَر تھا نہ آستاں، بالآخر مغرب سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی منزل العالمین تھی۔ اِسی میں بیٹھ گئے اور العالمین پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

العالمین میں صرف ایک یونٹ تھا اور وُہ بھی چھوٹا سا۔ رات اِن کے ساتھ بسر کی۔ اُن دِنوں العالمین ایک غیر معروف سا مقام تھا اور ابھی یہ بات اِس سنسان سے قریہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ صرف چند ہی ماہ بعد منٹگمری اور رومل اِسے تاریخ کے

صفحات میں دوام بخش دیں گے۔ بہر حال ہم نے العالمین کی رہائش کا تاریخی فخر العالمین کے زمانہ ما قبل تاریخ میں ہی حاصل کر لیا۔

دُوسرے دن علی الصُبح اسکندریہ جاتے ہوئے ایک اور فوجی ٹرک مل گیا اور شام کو ہمیں بصیلی کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز فی الفور ہمارے گلے کا آپریشن کر دیا جائے گا لیکن ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو گلے میں ذرا سا پینٹ لگا دیا اور فرمایا کہ ہفتہ بھر غرّارے کرو اور اُسی دِن ڈِسچارج کر کے قاہرہ ری انفور سمنٹ کیمپ میں بھیج دیا۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب نے زبان سے تو نہ کہا، لیکن اُن کا مطلب واضح تھا کہ جنگ جاری ہے۔ محض گلے کی خرابی سے تیارداری کی عیاشی نہیں کرائی جا سکتی۔ ابھی جنگ لڑو۔ بچ گئے تو گلے کا علاج ہوتا رہے گا اور کام آ گئے تو فرشتے تمہارے لیے بہشت یا دوزخ کا فیصلہ گلا دیکھ کر نہیں کریں گے۔ قِصّہ کوتاہ دوسرے روز ہم قاہرہ کے قریب ری انفور سمنٹ کیمپ میں پہنچ گئے۔ سرکاری مقصد یہ تھا کہ ایک ہفتے کے آرام کے بعد ہمیں حسبِ ضرورت جنگی اِستعمال میں لایا جائے۔

قاہرہ کا یہ مشہور ری انفور سمنٹ کیمپ مینا کیمپ کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ اِسی نام کے علاقے میں قاہرہ شہر سے کوئی دس میل دور اہرامِ مصر کے سائے میں واقع تھا۔ کیمپ میں پہنچے تو اُس کے حسنِ اِنتقام کا فوری احساس ہوا۔ گاڑی سے اُترنا تھا کہ ایک صوبیدار صاحب مع چند سپاہیوں کے استقبال کو بڑھے۔ فی الفور ہمارا سامان خیمے میں

پہنچایا گیا اور خود ہماری وہاں تک رہنمائی کی گئی۔ خیمے کے دروازے پر ایک سیاہ فام مگر صاف سُتھرا اور ادھیڑ عُمر کا متبسّم سپاہی کھڑا تھا۔ بولا:

"میں سپاہی بابو رام ہوں، آپ کا اردلی۔"

خیمے کے دروازے سے بابو رام کا ظہور اِس قدر اچانک واقع ہوا تھا، جیسے الہٰ دین نے چراغ رگڑا ہو اور دھوئیں سے ایک لاغر سا جن نمودار ہوا ہو۔ بابو رام نے ایک خاص اردلیانہ ادا سے چِق اُٹھائی اور ہم خیمے میں داخل ہوئے۔

کیا سُتھرا اور کشادہ خیمہ تھا! درمیان میں پلنگ اور لکھنے کی میز اور کرسی؛ اُس طرف ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری۔ خیمے کے سامنے کی دیوار میں دروازہ تھا۔ پَردہ اُٹھایا تو ایک دُوسرے مگر چھوٹے سے خیمے میں کھُلا۔ اندر کی چیزیں دیکھیں تو محسوس ہوا خواب دیکھ رہا ہوں۔ تین بالٹیاں بظاہر پانی سے بھری پڑی تھیں۔ سہمے سہمے ہاتھ لگایا تو سچ مُچ پانی تھا۔ صحرا کی جنگ کے بعد ہمیں چُلّو بھر سے زیادہ پانی یکجا دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ اَب نہ صرف بالٹیوں پانی موجود تھا، بلکہ اُس کے اِستعمال پر اختیار بھی تھا۔ بے اختیار اپنی خوش نصیبی پر کسی واضع ڈھنگ سے ناز کرنے کو جی چاہا۔ مثلاً ایک والہانہ رقص سے، جیسے ہٹلر نے فتح فرانس کی خبر مِلنے پر کیا تھا، مگر پیچھے اردلی دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے رقص کرنے میں اپنے عہدے کی سطوت مانع آئی! (ہٹلر عہدے کے لحاظ

سے ہم سے بہت جونئیر تھا۔ وُہ کارپول، ہم نیم لفٹین!) لہٰذا ناچ سے تو گریز کیا، لیکن آناً فاناً کپڑے اُتارے اور ایک انتہائی سُرور انگیز غسل سے دادِ عیش دی۔ بعد کی زندگی میں اِس سے زیادہ مکلّف غسل بھی کیے، مگر وُہ سُرور نہ حاصل ہو سکا کیونکہ پھر کبھی مہینہ بھر باتیمّم زندگی بسر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

غسل ہو چُکا تو اردلی ایک صاف سُتھری ٹرے میں چائے رکھ کر لایا۔ ساتھ بسکٹ اور سیب بھی۔ لیکن یہ سب تکلّف اُس شخص کے لیے ہو رہا تھا جو کل تک بُلی بِیف بشمول ریگِ صحرا پر گزارا کرتا تھا۔ اپنی خوش بختی پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ کہیں کسی کلرک کی غلطی سے ہمارا نام نیم لفٹینوں کی بجائے جرنیلوں کے خانے میں تو نہیں لکھّا گیا تھا؟ بہر حال ایسی غلطی اگر کہیں ہوئی بھی تھی تو اُس کا پکڑنا کسی جرنیل کا کام تھا۔ بالفعل ہمارا کام اِس چائے کو پینا تھا۔ دھیرے دھیرے پینا تھا اور جی بھر کر پینا تھا۔

چائے کے دوران اردلی سے مزید تعارف ہوا۔ معلُوم ہوا مدراس کا رہنے والا ہے۔ ہماری طرح جنگ کی ابتدا میں بھرتی ہوا اور اپنے کمالات کے مظاہرے کے لیے کیٹرنگ کور کا انتخاب کیا یعنی فوجی مَیسوں اور لنگر خانوں میں خدمت کرنے لگا۔ شکل و صُورت سے بابو رام پیدائشی خدمتگار نظر آتا تھا۔ اس کے اردلی پن میں گویا مشیتِ ایزدی جھلک رہی تھی۔ کارِ خدمت میں وفودِ شوق اور محنتِ شاقہ میں خندہ پیشانی، یہ مشیت ہی کا توفیض تھا۔ بابو رام نے ہمیں پہلی مُلاقات پر ہی رام کر لیا۔ باتوں باتوں میں

بولا:

"صاحب، شام کو کیا کھائیں گے؟"

اَب کھانے کے مُعاملے میں مَیسوں میں رہنے والوں پر مختاری محض تُہمت ہے جو خداوندانِ میس چاہے ہیں، سو کرے ہیں۔ ہم نے کہا:

"بابو رام جو میس میں پکے گا، کھانا پڑے گا اور کھائیں گے۔ ہماری پسند کیا معنی؟"

بولا: "اگر اجازت ہو تو آپ کے لیے علیٰحدہ مدراسی دال پکالاؤں؟"

اَب مجھے بابو رام کی دال کھانے کا ایسا شوق نہ تھا، اِس لیے نہیں کہ ایک ہندو کے پکے ہوئے کھانے سے میرے اِسلام کو کچھ خطرہ تھا۔ آفیسرز میس میں کوئی مُلازم رنگ یا مذہب کے اعتبار سے اچھوت نہ تھا۔ مجھے اعتراض تھا تو دال پر۔ کیونکہ دال سے میرا اسلام واقعی خطرے میں تھا۔ مُجھے ہمیشہ خدشہ رہا ہے کہ اگر مسلسل دال کھائی جائے تو مسلمانی زائل ہو جاتی ہے۔ بہر حال بابو رام کی دل شکنی منظور نہ تھی۔ کہا: "پکاؤ دال۔"

بابو رام نے کہا: "شام کا کھانا میس کی بجائے خیمے ہی میں کھایئے گا۔"

یہ مزید عیاشی تھی۔ دعوت قبول کی اور ایک آسودگی اور فراغت کے احساس سے خیمے سے باہر نکلے کہ تھوڑی سی مینا کیمپ کی سیر ہی کر لیں۔ بَصرے والے شائبہ کیمپ کی

طرح مینا کیمپ بھی ایک شہر تھا جس کے مختلف حِصّے تھے۔ برطانوی وِنگ، ہندوستانی وِنگ، پلٹن کا محلّہ، توپخانے کا محلّہ وغیرہ وغیرہ۔ کیمپ میں ہندوستانی افسروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اُن سے ملاقات ہوئی تو گفتگو قاہرہ اور اس کی دلچسپیوں کے گرد ہی گھومتی رہی۔ جسے دیکھو فدائے قاہرہ۔ کوئی گراپی کا دلدادہ۔ کوئی بادیہ کا شیدائی۔ کسی پر کانٹی نینٹل کا جادو اور کوئی شپرڈ کا پرستار۔ اِن جگہوں کی رنگینیوں کے قصّے کچھ اِس اشتعال انگیز انداز میں سُنائے گئے کہ اسی ساعت قاہرہ کی سمت ہوا ہو جانے کو جی چاہا۔ اور قاہرہ کوئی دُور بھی نہ تھا، یہی دس بارہ میل۔ سڑک پر کھڑے ہو جاتے تو کوئی گاڑی یا ٹیکسی قاہرہ جاتی ہوئی مِل ہی جاتی۔ مگر یہ کہ کیمپ کے کمان افسر سے رُخصت لینا لازم تھا اور ہم نے ابھی بمشکل اپنی آمد کی رپورٹ دی تھی۔ سو قاہرہ جانا کسی دُوسرے وقت پر اُٹھا رکھا۔

کیمپ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی۔ اپنے خیمے کو لوٹے۔ اندر داخل ہونے کے لیے چِق اُٹھانا چاہی تو خود بخود اُٹھ گئی۔ دیکھا تو چِق کے پردے میں بابو رام بول رہا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو خیمہ جگمگا رہا تھا۔ بابو رام نے سرکاری بلب کے علاوہ ایک غیر سرکاری بلب بھی لگا دیا تھا اور ہماری غیر حاضری میں ایک چھوٹا سا قالین بھی پیدا کر لیا تھا۔ میز پر ایک گلدستہ بھی لگا دیا تھا اور ساتھ تپائی پر مشروبات کی بوتلیں اور بلور کے جام چُن دیے تھے۔ ایسا بندوبست ہم نے پشاور چھاؤنی میں بھی کم دیکھا تھا۔ ہماری دشت پیمائی کا صِلہ

دینے کے لیے سچ مُچ کوئی فراخ دِل بلکہ فضول خرچ فرشتے مقرّر ہوا تھا۔ پھر دفعتاً بابو رام نے جیسے ہمارے دِل کے اندر جھانک لیا ہو۔ آگے بڑھ کر وُہی مشروب تیار کیا جو ہمارے دِل میں تھا اور ہم ایک پُختہ اور خرانٹ جرنیل کی طرح اُسے جرعہ جرعہ پینے لگے۔ بابو رام اِس خاموشی سے غائب ہوا کہ ہمیں احساس تک نہ ہونے دیا۔

کوئی آٹھ بجے کا وقت ہو گا کہ بابو رام خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں ایک قاب تھی۔ ہمارے سامنے رکھ کر اُوپر سے پَردہ سِرکایا تو مانوس انگریزی کھانے کے پہلو بہ پہلو ایک سبز مرچوں میں ملبوس پلیٹ نظر آئی۔۔۔ یعنی بابو رام کی تخلیق مدراسی دال! لیکن گہری سبز اور تلخ مرچوں کی دید سے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔ بابو رام ہماری سراسیمگی دیکھ کر بولا:

"دال مِرچوں کے نیچے ہے۔ آپ صِرف دال بھی کھا سکتے ہیں، لیکن مِرچوں کا بھی ساتھ رہے، تو دو آتشہ ہو جائے گی۔"

دِل سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ یک آتشہ پر ہی اِکتفا کرنا قرین مصلحت ہے؛ چنانچہ مِرچوں سے قطع نظر کر کے بابو رام کی دال سے بسم اللہ کی۔ پہلے لُقمے کے ساتھ ہی ہمارے اندر زندگی نے کروٹ لی۔ بخدا یہ دال مونگ نہ تھی، دالِ حیات تھی۔ اُس شب ہم نے انگریزی کھانے پر ہر چند کہ توجہ دی، کم دی۔ اور اس کے بعد جتنے دِن مینا

کیمپ میں رہے، بابو رام کی دال سے محروم رہنا گناہ سمجھا۔ جہاں تک ہماری مسلمانی کا تعلّق تھا؛ اِس میں ایک نئی تازگی اور تابندگی محسوس ہونے لگی۔ اور وُہ جو مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ دو چار دِن مونگ کی دال کھالوں تو اُردُو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے، کسی اور دال کی بات ہوگی۔ ورنہ اگر اُن کا روئے سُخن بابو رام کی دال کی طرف ہے تو یہ بہتان ہے۔ اگر جناب یوسفی مینا کیمپ میں میرے ہم نوالہ ہوتے تو آج چراغ تلے لکھنے کے علاوہ صاحبِ دیوان بھی ہوتے اور بنک کی بجائے کسی بریگیڈ کی کمان کر رہے ہوتے۔

قاہرہ ایّامِ جنگ میں

دُوسری صُبح ایک گہری، میٹھی اور لمبی نیند سے بیدار ہوئے اور عین اُسی لمحہ بابو رام چائے کی صبوحی لے کر خیمے میں داخل ہوا۔ بیداری اور چائے بیک وقت کیونکر ظہور میں آئیں، میرے فہم سے بعید تھا۔ اِن اسرار کو بابو رام جیسا دانائے راز ہی کھول سکتا تھا، لیکن میں یہ راز کرید کر بابو رام کی الہامی بیراگیری کا انداز نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر تازہ وردی پہن کر کیمپ کے دفتر میں گیا۔ ایڈجوڈنٹ صاحب کو حاضری دی۔ کمان افسر صاحب سے مختصر اور خوشگوار سی مُلاقات ہوئی۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ہفتہ بھر کے لیے ہر قسم کی ڈیوٹی معاف ہے اور یہ کہ ہفتہ بھر ہم اپنے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ یعنی چاہیں تو تصوّرِ جاناں میں دن بھر لیٹے رہیں اور چاہیں تو تلاشِ جاناں میں اہرامِ مِصر پر چڑھ دوڑیں۔۔۔ یہ دُوسری حرکت ہم نے کی بھی لیکن کافی عرصہ بعد میں۔۔۔ سرِ دست ہمارے دِل میں قاہرہ بستا تھا۔ ایک دو دیسی افسر

اُدھر جا رہے تھے، ان کے ہم رکاب ہو لیے۔

مینا کیمپ سے نکلتے ہی کار ایک کشادہ بلند اور دلکش سی شاہراہ پر آ نکلی۔ یہ مینا روڈ تھی جو اہرام اور قاہرہ کے درمیان شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اِس کی دس میل کی لمبائی میں دونوں طرف متمول پاشاؤں کے وِلّا (VILLAS) تھے جو باغوں کے لامتناہی سِلسلے میں واقع تھے۔ وِلّاؤں اور پاشاؤں کے باطن کے حالات تو خُدا جانے اور خُدا کے جاننے کے لیے یہاں بہت کچھ تھا لیکن ان کا بیرونی منظر بے حد جاذب تھا۔ قاہرہ کی تمہید واقعی حسبِ توقّع تھی۔

آگے چل کر دریائے نیل کا پُل عبور کیا تو گویا قاہرہ کے دروازے پر دستک دی۔ اِدھر قاہرہ نے زندگی سے بھرپور جواب دیا۔ عورتوں اور مَردوں سے بھرے ہوئے بازار مَرد اکثر فوجی، باوردی اور غیر مُلکی لیکن ذرا کھوئے کھوئے سے۔ گو یہ سمجھنا مُشکل نہ تھا کہ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ عورتیں اکثر مِصری اندازِ لباس اور آرائشِ گیسو میں بے حد مغرب زدہ۔ مگر ایک خاصی تعداد دُخترانِ مغرب کی بھی تھی جو خاکی وردیوں میں سینہ تان کر مِصر کے بازاروں میں اکٹو سروس بجا لا رہی تھیں۔ مجموعی طور پر زنانہ اور مردانہ فوجیوں کی اِس قدر کثرت تھی گویا اصل جنگ صحرائے لیبیا میں نہیں قاہرہ کے بازاروں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور فوجی بھی ہر مُلک کے۔ ہندی۔ برطانوی۔ آسٹریلوی۔ کناڈوی۔ نیوزی لینڈوی۔ ایرانی۔ افریقی۔ فرانسیسی۔ پولستانی۔ الغرض

ہٹلر کے تمام تر سِتم بُردہ مِصر میں آ جمع ہوئے تھے اور ہر طرف سے ہائے گُل اور ہائے دِل کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔

قاہرہ کی دُکانیں جنگ کے باوجود جملہ سامانِ عشرت سے آراستہ تھیں۔ ریستورانوں اور تفریح گاہوں میں وُہ ہجومِ خلق کہ کھوّے سے کھوّا چھِلتا تھا۔ بلکہ بعض خواتین و حضرات نے تو گویا اپنے شانوں کا صحیح اِستعمال ہی یہاں آ کر سیکھا تھا۔ قاہرہ میں جنگ کی فقط دو علامات تھیں۔ ایک بڑی دُکانوں کے سامنے ریت کی بوریوں کے پُشتے کہ بمباری میں سپر ثابت ہوں اور دُوسرے بلیک آؤٹ، یعنی سرِ شام ہی روشنیوں کو گُل کر دینا یا مدھم رکھنا کہ دُشمن کے ہوائی جہازوں سے قاہرہ کا پَردہ رہے۔ لیکن علامتِ جنگ بہر حال علامت ہے، جنگ نہیں، اور بے شمار ایسے فوجی تھے جو قاہرہ میں محض بزمِ یک شب منا کر سیج مُچ محاذِ جنگ کو جا رہے تھے اور اس ایک رات کی مختصر سی فُرصت میں زندگی کی تمام تر آسودگیاں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اور انہی کی خاطر قاہرہ نے قارون کی طرح گویا راستے میں خزانہ لُٹا رکھا تھا۔ جدھر دیکھو مہ رُخوں اور زُہرہ وشوں کے پَرے، جو نہ صرف تعداد بلکہ شوق میں بھی مُسافر فوجیوں سے ایک قدم آگے۔ اوّل تو سرِ راہ ہی نظریں لڑ جاتیں، ورنہ کسی رقص گاہ کا ٹکٹ لے کر فقط داخل ہونے کی ضرورت تھی اور پھر بقول اکبر:

یاں جوانی کی اُمنگ اور اُن کو عاشق کی تلاش

ہمیں اپنے مُلک میں یہ کیفیت نا قابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔ ذرا اُن ملکوں سے پُوچھیں جو جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اخلاق اور عصمت جنگ کے اوّلین شکار ہوتے ہیں اور کسی کو بُرائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہمارے ساتھی کہ راہ و رسم منزل سے بے خبر نہ تھے، گراپی میں داخل ہوئے۔ گراپی شارع سلیمان پاشا کی مشہور رقص گاہ تھی۔ اندر قدم رکھّا تو یوں محسوس ہوا گویا بُت کدے کا دَر کھُلا۔ گراپی کے کُشادہ در و دالان میں سینکڑوں مَرد اور عورتیں مصروفِ اختلاط تھے۔ دفعتہً بینڈ پر ایک نئی دُھن کی ابتدا ہوئی اور مَرد التجائے رقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا جھکے۔ ہم نے التجائیں رَد ہوتی بھی دیکھیں، لیکن اکثر نے شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ بلکہ کئی خواتین تو اِس بیتابی سے طالبانِ رقص کو تاڑ رہی ہوتی تھیں کہ اِلتجا ابھی اُن کے لبوں تک نہ پہنچی ہی نہیں اور اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید! یہ لازم نہ تھا کہ پسند کی خاتُون سے پیشگی تعارف بھی ہو۔ مغربی رقص کے آداب نے اجنبی کو بہت کچھ حقوق دے رکھے ہیں؛ چنانچہ تعارف اکثر رقص کے دوران ہی ہوتا اور بارہا ایسا ہوا کہ رقص کرنے کو اُٹھے تو اجنبی اور کر کے بیٹھے تو رفیق بلکہ رفیقِ زندگی!

شاید یہ زنانِ مِصر کا شیوہ ہے کہ دِل دینے میں بہت شتابی کرتی ہیں۔ خصوصاً قبطی اور یہودی۔ اگرچہ مُسلمان لڑکیاں بھی ایسی سُست مزاج نہ تھیں۔ خصوصاً جہاں معاملہ فوجیوں کے ساتھ ہو۔ آخراِس نیک روایت کی بانی مِصر کی خاتُونِ اوّل یعنی قلوپطرہ ہی تو تھی۔ لیکن دورِ حاضر کی دوشیزائیں کہیں زیادہ باوفا تھیں۔ گو اتنی ہی زیادہ بودی تھیں۔ اگر پہلی مُلاقات پر ہی کسی نے انگوٹھی پہنادی یا فقط دِکھلا ہی دی تو وفودِ شوق سے اُن کے چہرے تمتما اُٹھتے تھے اور جیسے کوئی دیرینہ حسرت پُوری ہو گئی ہو، چلّا کر کہنے لگتیں:

"خاتم! خاتم!"

اور پھر کسی رسمی نخرے کے بغیر پیمانِ وفا باندھنا شروع کر دیتیں۔۔۔ یہ حسینانِ مِصر کی سادگی تھی یا پُرکاری، خُدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن جہاں تک عشّاق کی نیت کا سوال ہے۔ کچھ ہم بھی جانتے ہیں۔ اِن کشتگانِ محبّت میں صرف ایک آدھ ہی سادہ ہوتا تھا، باقی ننانوے فیصد اچھّے خاصے پُرکار عاشق تھے۔ کیونکہ بہت کم افسر ایسے تھے جو قاہرہ کا رُخ کرتے وقت جیب میں دس بارہ انگشتریاں نہ ڈال لیتے!

لیکن گراپی کی پہلی شام کا ناقابلِ فراموش واقعہ حسینانِ مِصر کی دلنوازی نہ تھی بلکہ ایک عالم دین کی زیارت۔۔۔ گراپی کے بار پر کھڑے تھے اور حسبِ توفیق نرم و درشت مشروبات سے دِل بہلا رہے تھے کہ صدر دروازے سے ایک مولانا داخل ہوئے۔

یوں جیسے داغ کی غزل کے کوئی شیخ جی اُٹھے ہوں۔ بے حد محتسبانہ حُلیہ، متشرح داڑھی اور باوضو چہرہ۔ سَر پر سُرخ تربوش اور سفید عمامہ۔ جسم مُبارک پر اُجلا اور لمبا جُبّہ۔ بائیں ہاتھ میں تسبیح اور دایاں خالی۔ شاید اِس لیے کہ دُرّہ استعمال کرنا پڑ جائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حاضرین سے مُسلمانوں کو الگ کر کے کوتوال کے سپُرد کر دیں گے کہ مَے خانے میں کھڑے پائے گئے، لیکن جناب بار کے قریب آئے تو ذرا تھمے۔ تا آنکہ مَے فروش سے آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر ایک متبرّک سی مُسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل گئی اور ایک مقدس آسمانی آواز میں بارمین کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

"السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔۔۔۔۔۔واحد وِسکی۔"

بارمین نے تعمیلِ ارشاد کی اور جامِ وِسکی پیش کیا۔ جناب شیخ نے جام تھاما۔ پہلے اِس انداز سے دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پی رہے ہوں۔ پھر آنکھیں بند کر لیں، جام کو لبوں تک لائے اور پھر جس لُطف، جس سکون اور جس حُسن سے گھونٹ گھونٹ پینے لگے، کہنہ مشق مہ گساروں کے دِل موہ لیے اور مبتدیوں کو مَے نوشی کا حرفِ آخر پڑھا دیا۔

اس بات کے اعتراف سے ہمیں باک نہیں کہ اس رات گراپی کی رنگینیوں نے ہمیں مغلوب کر لیا اور جب کہیں پچھلی رات کیمپ میں پہنچ کر بستر پر دراز ہوئے تو گراپی کے

ہنگامے خواب میں بھی ہمارے دماغ سے محو نہ ہو سکے۔

رہا خواب میں اُن سے شب بھر وصال

مِرے بخت جاگے، میں سویا کیا

ہمیں قاہرہ میں آرام کے لیے سات دن مِلے تھے۔ یہ آرام ہم نے مُسلسل قاہرہ نوردی میں حاصل کیا کہ اِس کے بعد ہمیں ہٹلر قاہرہ کی تفریح یا شاید زندگی کی ہی مُہلت نہ دے اور قاہرہ میں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا!

- وُہ غیر فانی اہرام اور ابوالہول، لیکن اہرام سے زیادہ ہمیں اُس ترجمان نے متحیر کیا جو لگاتار ایک گھنٹہ فصیح انگریزی میں تاریخِ اہرام پر بولتا رہا اور خود خاک نہ سمجھتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور ترجمان سے بھی بڑا اعجوبہ وُہ مِصری جوان جو پانچ منٹ میں اِن فلک بوس اہرام کی چوٹیوں کو ہاتھ لگا کر سالم اُتر آتا تھا۔

- وہ قاہرہ کا کوہ پیکر حصار جو کئی خونیں اِنقلاب دیکھنے کے بعد اب نمبر ۱۵ انڈین ہاسپٹل میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا اور جس کی بڑی کشش اس کے تاریخی مقامات نہ تھے بلکہ ہسپتال کی بد تمیز اینگلو انڈین نرسیں جو صحت مندوں پر مہربان اور مریضوں پر نامہربان تھیں۔ اور وُہ خاص نرس جسے اِس خاکسار نے

زخمی گورکھا سپاہیوں کو ڈیم فُول کہتے سُنا، تو بِلا اختیار برطرف کر کے ہسپتال سے باہر کیا اور بعد میں خُود برطرف ہونے سے بال بال بچا۔

- وُہ قلعہ کی بلندی پر چمکتا ہوا ہیرا یعنی مسجد علی۔ وُہ رنگ و سنگ کا معجزہ جس میں نمازی کم اور سیاح زیادہ آتے تھے
- وُہ مُشکی بازار۔ وُہ تنگ و تاریک سی لکیر جس کی پُراسرار دکانوں کے سامنے جوئندگانِ عجائبات چیونٹیوں کی طرح رینگتے پھرتے تھے۔
- وہ موم کا عجائب خانہ جس میں داخل ہوتے ہی مرحوم سعد زاغلول پاشا بقید حیات کھڑے نظر آتے تھے۔۔
- وُہ شپرڈ اور کانٹی نینٹل ہوٹلوں کی ٹیرس جہاں بلیک آؤٹ کے سائے میں گناہوں کے ابتدائی سودے ہوتے تھے اور پھر قاہرہ کی ٹیکسیوں میں سارے شہر کو لپیٹ میں لے لیتے تھے۔
- وُہ جزیرہ ریس کلب کی گھڑ دوڑیں، جہاں پہلے روز ایک گورے کیپٹن اور ایک گورے میجر کی ٹِپ پر پورے چالیس دینار جیت لیے اور بعد میں جب اِن افسروں سے تفصیلی تعارف ہوا تو ایک پرنس علی خان نکلے اور دُوسرے ڈگلس

فیر بنکس جونئیر اور جن کے ساتھ چند لمحوں کی ہم نشینی کا حسینانِ قاہرہ پر یہ اثر ہوا کہ ہمیں بھی اپنے دائرہ نوازشات میں شامل کر لیا۔ شاید اس مقولے کے تحت کہ گندم اگر بہم نرسد بھُس غنیمت است۔ اور خُدا گواہ ہے کہ ہم نِرے بھُس بھی نہ تھے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ ہونے کے علاوہ چند اور ٹھوس خوبیوں کے مالک بھی تھے

- وُہ نیل کے کنارے پیجن ریستوران جس کی نشستیں گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں سجتی تھیں اور سرِ شام ہی بلیک آوٹ کی وجہ سے عافیت جو جوڑوں سے پُر ہو جاتی تھیں اور اسی پیجن کی وُہ شام جو ہمارے دوست ورما اور ہم پر نزولِ الطاف ہوا۔ لاریب اس شام نے ہمیں ایک لازوال دولت سے مالا مال کر دیا، مگر خُدارا ہم سے اِس دولت کی تفصیل پُوچھنے پر اصرار نہ کیجئے گا کہ اِس دن کے بعد اِس شام کا جب بھی کسی نے ذکر چھیڑا، اِک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔

- اور وُہ مینا روڈ کی نائٹ کلب آبرژ[۴۴] کہ جس کی کشش وُہ مخصوص شکمی رقص نہ تھا، بلکہ اِس رقص و سرود کا سرپرستِ اعلیٰ یعنی شاہ فاروق جو

---

[۴۴] Auberge Des Pyramides

کلب کے شاہ نشین سے اپنے مقربین کے ساتھ دادِ رقص و مَے دیتے اور ہم جیسے ہزاروں پست نشینوں کو شرفِ زیارت اور درسِ عبرت بخشتے کہ شاہ ملک و دین کا اندازِ داد بجائے خود ایک تماشا تھا یعنی ہر رقص کے بعد آپ رقاصہ کو بُلا کر اپنے پہلو میں بٹھاتے اور دستِ خاص سے اُس غارت گرِ دین و ایمان کو جامِ مَے پیش کرتے۔ پھر التفاتِ شاہی مُسکراہٹوں، گدگدیوں، قہقہوں، بغل گیروں اور کبھی کبھی ہلکے بوسوں میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ الف لیلہ کی بادشاہی معلوم ہوتی تھی اور تھی۔

○ اور وُہ جامعہ ازہر کہ جس کے سقف و دالان ہزار شوق سے دیکھنے گئے اور لوٹے تو اس کی تاریخی عظمت سے مرعوب تھے لیکن موجودہ دقیانوسیت سے مایوس۔ جامعہ کے طلباء سے تبادلۂ خیالات ہوا تو حضرت علامہ کا مِصرع یاد آیا۔

○ اے مسلماں، اپنے دِل سے پُوچھ، مُلّا سے نہ پُوچھ

○ وُہ قاہرہ کی شکستہ و ریختہ ٹریم کہ جس کی سیٹی اور کنڈکٹر کی یلّٰے آج تک کانوں

میں گونجتی ہے۔ اور وُہ تین الفاظ جو قاہرہ میں ہر قدم پر راستہ کاٹے تھے:

لوس۔۔۔ بخشیش...مافیش

وُہ مکی کے بھٹے بیچنے والوں کی صَدا۔ "رفیق چھلّی۔" جو وُہ لوگ ہمارے پنجابی سپاہیوں کی کشش کے لیے لگاتے اور ہمارے سپاہیوں کی اخوّتِ اسلامی کا وُہ منظر کہ اپنے مِصری دُکانداروں کی ہزاروں "چھلّیاں" سرِ بازار بھون کر اپنا پیٹ اور اُن کی جیبیں بھر دیتے۔ ہمارے سپاہیوں کی اِس فالتو اخوّت کا ایک مظاہرہ کبھی نہ بھولے گا۔

جیسا کہ ایک جگہ پہلے کہا جا چُکا ہے۔ ہندوستانی مُسلمان (یا اَب کہنا چاہے پاکستانی مُسلمان) بہت سادہ ہے۔ عرب ملکوں اور وہاں کے لوگوں سے اِسے والہانہ عشق ہے اور ہر عرب کے متعلّق یہی سمجھتا ہے کہ بعد از نبی بزرگ توئی قِصّہ مُختصر۔ اُسے یہ خوشی فہمی ہے کہ عرب بھی ہمیں چچا زاد ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اکثر عربوں کو اِن رشتہ داروں کے وجود کا ہی علم نہیں۔

اُن دِنوں قاہرہ میں میلادِ النّبی کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ خود شاہ فاروق تقریبات میں حِصّہ لیتے۔ اس سال کے یومِ میلاد میں ہمارے کیمپ کے مسلمان جوانوں نے بھی شرکت کرنا چاہی۔ چُونکہ ہمارے سپاہیوں کا مِصریوں کے ساتھ اختلاط کا مُعاملہ تھا کرنل صاحب نے مُجھے خُود ساتھ جانے کو کہا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ

ہونے پائے۔ چنانچہ میں صوبیدار صاحب اور کوئی پچاس جوان، صاف سُتھری وردیاں پہنے فوجی لاریوں میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں پہنچے۔ شاہ فاروق کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا کہ صوبیدار صاحب نے میرے کان میں کہا:

"اگر اجازت دیں تو شاہ فاروق کے آنے پر ہم نعرۂ تکبیر بلند کریں؟"

میں نے کہا "آپ کو کیا تکلیف ہو رہی ہے جو آپ ایسی حرکت کرنا چاہتے ہیں؟"

بولے۔ "خلیفۂ اسلام ہے اور ہمارا دِل چاہتا ہے کہ اپنے مُسلمان بادشاہ کے لیے نعرہ لگائیں۔"

مَیں نے کہا۔ "ہم وردی میں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں اِس تقریب میں متانت سے حِصّہ لینا چاہیے۔ یہ موقع نعرہ بازی کا نہیں۔ وطن میں جا کر یا یونٹ میں ہی کوئی جلسہ کر کے نعرے لگا کر دِل ہلکا کر لیں گے۔"

صُوبیدار صاحب خاموش ہو گئے، لیکن سخت ناخوش۔ میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وُہ میرے غیر اسلامی رویے پر سخت برہم ہیں۔ اِتنے میں آواز آئی کہ جلالۃُ المُلک کی سواری آ رہی ہے۔ یہ سُنا تو صوبیدار صاحب کا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اُن کی نظریں اُس سمت میں گڑ گئیں جدھر سے شاہ فاروق کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا۔ ان کا

تنفّس تیز ہو گیا۔ میں نے اُن کی حالت غیر ہوتے دیکھی تو ان کے بازو پر ہاتھ رکھا، لیکن ہاتھ کی بجائے اُن پر شہتیر بھی آ گرتا تو اُن کی توجہ کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ وُہ اب ایک دُوسری دُنیا میں پہنچ چکے تھے۔ جو نہی شاہ فاروق نے دروازے کے اندر قدم رکھا صُوبیدار صاحب بجلی کی سُرعت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فضا میں ایک آواز بُلند ہوئی۔

"نعرہ۔۔۔اے۔۔۔۔ تکبیر"

نعرہ اور لمبی اے کے بعد تکبیر کا لفظ اس طرح ادا ہوا جیسے فیتہ جلنے کی شُوں شُوں کے بعد یکلخت گولہ پھٹتا ہے اور جو نہی صُوبیدار صاحب لفظ تکبیر تک پہنچے، ہمارے پچاس جوانوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا:

"اللہ اکبر۔"

اِس پر شاہ فاروق کسی قدر حیرت سے مُسکرائے اور حاضرین نے شاہی مُسکراہٹ سے اشارہ پا کر تالیاں بجا دیں۔

واقعہ یہ تھا کہ ہمارے نعرے کو کسی نے سمجھا نہ تھا۔ چاروں الفاظ بے شک عربی کے تھے لیکن اُن کا پنجابی تلفّظ اور وُہ بھی ایک نعرے کی شکل میں مِصریوں کے فہم سے بعید

تھا۔ وُہ یہ سمجھے کہ ہندوستانی فوجیوں نے کوئی تماشہ کیا ہے۔ چنانچہ مَیں نے صُوبیدار صاحب کو ایک قہر آلود نِگاہ سے دیکھا، لیکن صوبیدار صاحب تو اپنے خلیفہ کے حضور میں تھے۔ ایک خستہ نیم لفٹین کیا اور اُس کی نگاہ غضب کیا؟ شاہ فاروقی ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ہمارے قریب سے گزرے تو جیسے صُوبیدار صاحب کا اندر سے بٹن دَب گیا ہو۔ پھر دیوانہ وار اُٹھے اور دایاں بازو بُلند کر کے نعرۂ تکبیر کی صدا لگائی اور ایک مرتبہ اور اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ اب کے شاہ فاروق نے قہقہہ لگایا اور تمام حاضرین خصوصاً پاشاؤں نے شاہی قہقہے کی تائید میں اپنے جی حضوری گلے پھاڑ کر رکھ دیئے اور شامیانہ سر پَر اُٹھا لیا۔ ہر چند کہ اللہ اکبر کا نعرہ ہمارا دین و ایمان تھا؛ تاہم اِس مجلس میں اِس نعرہ بازی سے ہم تماشا بن گئے۔ شاہ فاروق کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کاروائی شروع ہوئی، تو جلسے کے منتظم بکری پاشا میرے پاس آئے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مُجھے مبارکباد دے کر کہنے لگے:

"تمہارے جوانوں کے تماشے سے جلالۃُ الملک بہت خوش ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ حضور کی رُخصت کے وقت بھی ایسا ہی کریں تو حضور اور خوش ہوں گے۔"

لگے ہاتھوں مُجھے یہ مژدہ بھی سُنایا کہ تمہاری چائے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اَب اگر مَیں بکری پاشا کو دِل کی بات بتاتا تو کہتا کہ تُم اور تُمہارا بادشاہ بہشت کی دُوسری

طرف جا سکتے ہو، لیکن یہ کہنے کی بات نہ تھی۔ بکری پاشا کی سُنا کیا اور خُونِ جگر پیتا رہا۔ صُوبیدار صاحب بھی بکری پاشا کی سُن رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ خلیفۂ وقت کی خوشنودی کا اِمکان ہو تو وُہ دِن بھر نعرے لگاتے رہیں گے۔ بہر حال جیسا کہ فوج کا دستور ہے مَیں نے صُوبیدار صاحب سے کہا:

"آپ نے عدولی حکمی کی ہے۔ اپنے آپ کو زیرِ حراست سمجھیں۔"

صوبیدار صاحب کے چہرے کا رنگ ذرا پھیکا ہونے لگا اور آپ نے میری طرف دیکھا بلکہ پہلی دفعہ محسوس کیا کہ یہ شخص بھی ساتھ آیا ہے اور غالباً اپنے دِل میں وہی باتیں سوچنے لگے جو گرفتاری کے وقت لوگوں کے دماغ میں آتی ہیں۔ چنانچہ ایک لمحے کے لیے ان کے ذہن میں خلیفۃ اللہ اور بکری پاشا کے درمیان سے ہمیں بھی بازیابی ہوئی۔ لیکن اِتنے میں فاروق تقریر کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے لمحے صوبیدار صاحب نے ہمیں دماغ سے نکال باہر کیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر وہی روشنی عُود کر آئی۔ ان کے نزدیک ہر مِصری باتیں کرتے وقت قرآن پڑھتا معلوم ہوتا تھا اور اب تو امیر المومنین خود سُخن سنج تھے۔ صُوبیدار صاحب کی آنکھوں کی روشنی ایک آتشیں شعلے میں تبدیل ہو گئی۔

فاروق ابھی دو لفظ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ صُوبیدار صاحب نے اپنی جگہ پر ہی یعنی

میری بغل سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ فاروق اس دخل در معقولات سے پہلے تو ذرا ٹھٹھک سے گئے لیکن معاً ان کے ہونٹوں پر تبسّم نمودار ہوا اور تمام پاشے کھکھلا اُٹھے۔ تالیاں بجنا شُروع ہوئیں۔ صوبیدار صاحب نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ مِصر فتح کر لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ایک مزید نعرہ لگایا مگر وفودِ جوش سے گلے پر معمول سے زیادہ زور دے دیا۔ آواز ہچکولے کھانے لگی۔ فاروق اور ان کے حواری ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ بکری پاشا بھاگے بھاگے آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ تمہارے سپاہیوں نے جلالۃُ الملک کو آمادۂ خندہ کر دیا۔ میں شرم سے غرقِ نیل ہو رہا تھا۔ نہ صرف ہماری فوج بلکہ قوم کی سُبکی ہو رہی تھی اور یہاں دونوں کی آبرو کا محافظ میں تھا کہ سب سے سینئر تھا لیکن اپنی سینیارٹی کا استعمال کس شکل میں کرتا؟

بکری پاشا کی داڑھی نوچ لیتا؟

فاروق کو شَٹ اَپ کہتا؟

صُوبیدار صاحب کے مُنہ میں فونٹین پَن ڈال دیتا

یا کمپنی کو وہیں فالن کر کے رائٹ لیفٹ کرتا جلسہ گاہ سے باہر نکل آتا؟

اِن میں سے کوئی حرکت بھی کرتا تو صُوبیدار صاحب سے بھی زیادہ ممتاز اُلّو بنتا؛ چنانچہ

انتہائی بے بسی میں سر جھکا کر بیٹھا کیا اور سُنتا رہا۔ خُدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے سر پر کیا کیا آرے چلے اور کیا کیا نعرے لگے۔

آخر مجلس برخاست ہوئی۔ واپس کیمپ میں پہنچے۔ صُوبیدار صاحب کہ اب دربارِ خلیفہ سے نِکل کر یونٹ لائن میں آ گئے تھے، برخاستگی بلکہ قید کی تیاری کرنے لگے۔ صُوبیدار صاحب کا جرم واقعی سنگین تھا لیکن اِس سادہ اور جوشیلے مُسلمان کا جیل خانے سے ایک بہتر اور باعزّت مَصرف بھی تھا یعنی محاذِ جنگ۔ دُوسرے روز دفتر میں بُلایا تو صُوبیدار صاحب سمجھے کہ اب کورٹ مارشل ہوتا ہے لیکن جب محاذِ جنگ پر جانے کا حکم سُنا تو اُن کی آنکھوں میں روشنی کی وہی پرانی کرن پھُوٹی۔ سلیوٹ کیا، دفتر سے باہر نکلے اور معاً اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ ظاہر تھا کہ یہ نعرہ امیر المومنین کی شان میں نہیں بلکہ "غریب الافسرین" یعنی اس خاکسار سیکنڈ لیفٹیننٹ کے اعزاز میں ہے۔

چند روز عباسیہ کیمپ (قاہرہ) میں

میناکیمپ میں ہمیں صرف سات دن کے لیے ٹھہرایا گیا تھا، لیکن مہینہ پُورا گزر گیا اور کسی نے ہم سے اِتنا سا آسان سوال نہ کیا کہ مُنہ میں کے دانت ہیں۔ اور ہمیں خود کیا ضرورت تھی کہ مُنہ کھولتے؟ ہمیں مولانا حالی کا فارمولا یاد تھا کہ عقلمند زبانیں بتیس دانتوں میں کیسے رہا کرتی ہیں، یعنی کروٹ نہیں بدلتیں۔ ہم نے بھی زبان نہ ہلائی، کیونکہ ہمیں ہٹلر کی ملاقات کی اِتنی بے تابی نہ تھی۔ چنانچہ اِس خدا داد فُرصت کو غنیمت جانا اور قاہرہ کا گھونگھٹ اٹھا کر ذرا تفصیل سے دیکھنا شروع کیا تا آنکہ خداوندانِ کیمپ کو احساس ہوا کہ یہ شخص کسی قدر زائد المیعاد ہو چلا ہے؛ چنانچہ ہمیں فی الفور کیمپ سے روانگی کا حکم مِلا لیکن حکم پڑھا تو ہمارا تبادلہ محاذ کی بجائے عباسیہ کیمپ میں کر دیا گیا تھا جو قاہرہ کے دُوسرے یعنی شمالی سِرے پر واقع تھا۔

محاذ کی بجائے عباسیہ جانا ہمیں یوں معلوم ہوا بے عُمرِ طبعی کے علاوہ کچھ فالتو زندگی

عنایت ہو گئی ہے اور ہم نے طے کر لیا ہے کہ اِن جھونگے کے ایام میں ہم قاہرہ کو حسبِ ضرورت تہ و بالا کریں گے، لیکن یہ خُدا تعالیٰ اور لیفٹیننٹ کرنل پیٹرسن کو منظور نہ تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل پیٹرسن عباسیہ کیمپ کے کمان افسر تھے۔ آپ کی سیرت کے کئی درخشاں پہلو تھے لیکن جس پہلو سے ہم ماتحتوں کا واسطہ تھا یعنی آپ کا مزاج، وُہ اِتنا درخشاں نہ تھا جتنا آتش فشاں تھا۔ نتیجہ ہمیں جرمنوں کے علاوہ اپنے کرنل صاحب سے بھی جنگ یا خانہ جنگی کا سامنا تھا۔ آپ ادھیڑ عُمر اور درمیانے قد کے خُوبرو سے آدمی تھے۔ مُلاقات پر ابتدائی کلمات میں ایسی شرافت و حلاوت کا اظہار کرتے کہ آپ پر فرشتہ ہونے کا گمان ہونے لگتا، لیکن جوں جوں گُفتگُو بڑھتی آپ صراطِ مستقیم سے بتدریج پھسلنے لگتے اور اپنی حلاوت میں عرقِ چرائیتہ ملانا شروع کر دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی شُبہ نہ رہتا کہ آپ کون سے فرشتے کے رُوبرو ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو آپ کے دفتر میں گُنگُناتے اور چہچہاتے داخل ہوتے دیکھا۔ چق کے پیچھے سے ایک دو قہقہے بھی سُنائی دیے لیکن پھر کبھی چیخیں بُلند ہوئیں، کبھی گالیاں گونجیں، کبھی مُکّے چلے اور کبھی تھپڑ برسے۔ چُونکہ کرنل صاحب مساوات کے قائل تھے؛ لہٰذا اِس کلیے سے کوئی ملاقاتی مستثنےٰ نہ تھا۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک دن کیمپ کے ایڈجوڈنٹ کیپٹن بِنگوفِنک شرفِ مُلاقات حاصِل کرنے کے بعد نکلے تو اُن کی آنکھ کے گِرد ایک بے عیب آبنوسی ہالہ تھا جو کرنل صاحب کے زورِ دست کا نتیجہ تھا۔ دُوسرے دِن سیکنڈ اِن کمانڈ میجر بریٹ برآمد ہوئے تو اُن کے کپڑوں پر روشنائی کی ایک وسیع اور دلکش سی افشاں تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ ایک دوات کا خُونِ ناحق بھی کرنل صاحب کے سَر پر ہے۔ غریب ہیڈ کلرک کے ماتھے پر تو ایک مُستقل مخروطی "روڑا" اُبھرا رہتا تھا جس کی تازگی میں کوئی کمی نہ آتی تھی کہ کرنل صاحب مُناسب وقفوں کے بعد اپنے پیپر ویٹ سے اس کی تجدید کرتے رہتے تھے لیکن کرنل صاحب کا شاہکار وُہ واقعہ تھا جو ایک صُبح انہیں کیمپ کے مالی کے ساتھ پیش آیا۔

سات بج رہے تھے۔ تمام لوگ اپنے کاموں پر آرہے تھے۔ کرنل صاحب بھی ہاتھ میں چھڑی لیے دفتر کی سمت رواں تھے کہ اتفاقاً آپ کی نِگاہ مالی پر پڑی جو پھُولوں کی کیاری میں کام کر رہا تھا۔ حسبِ معمول آپ نے اُسے بھی بے مقصد شرفِ گُفتگُو بخشا۔ پھر جیسا کہ دستور تھا، گُفتگُو شاباشوں سے گُزر کر گالیوں سے ہوتی ہوئی ڈنڈوں تک آ پہنچی اور مالی بھاگ نِکلا۔ خُدا جانے کرنل صاحب کو کیا سُوجھی کہ مالی کا تعاقب شُروع کر

دیا اور ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے مالی عربی زبان میں فریاد کرتا ہوا بھاگ رہا ہے اور پیچھے پیچھے کرنل صاحب انگریزی میں گالیاں دیتے ہوئے تیزی سے لپک رہے ہیں۔ کیمپ کے سینکڑوں افسر اور سپاہی کام چھوڑ کر تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کوئی بدتمیز جونئیر افسر جھوٹی تحسین کے طور پر کرنل صاحب کے حق میں تالی بھی بجا دیتا ہے۔ اِدھر بھاگتے مالی کے چہرے پر ہراس ہے اور پیشانی پر پسینہ۔ کرنل صاحب کی آنکھوں میں غضب ہے اور مُنہ پر جھاگ۔ راہ میں ایک ٹینک کھڑا ہے۔ مالی جان بچانے کی خاطر ٹینک پر چڑھ جاتا ہے لیکن پیچھے دیکھتا ہے تو کرنل صاحب بھی جوں تُوں کر کے ٹینک پر چڑھ رہے ہیں۔ مالی بے خطر چھلانگ لگا کر زمین پر آ جاتا ہے۔ کرنل صاحب بھی اتنی ہی بے ساختہ چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ مالی کہ جوان ہے سنبھل کر اُٹھتا ہے اور بھاگنے لگتا ہے لیکن کرنل صاحب کا یہ حال ہے کہ عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام۔ چھلانگ کے بعد ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ مالی مُڑ کر دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ آج کا تماشہ ختم ہے۔ آرام سے اُلٹے قدم جا کر کیاری میں نلائی شروع کر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے اِس حادثے میں کرنل صاحب کے پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ دو دن ہسپتال میں رہے۔ مہینہ بھر لنگڑاتے رہے اور مہینہ بھر ہمارا جینا حرام کر دیا۔ یعنی اور باتوں کے علاوہ ہمارے شہر جانے پر پابندی لگا دی۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ مالی کی گرفتاری میں غیر جانبداری سے کیوں کام لیا؟

عباسی کیمپ آرمرڈ کور یعنی رسالے والوں کا کیمپ تھا۔ فوج میں رسالے والے اپنے بانکپن کے لیے مشہور ہیں۔ تنگ پتلونیں اور لمبے کوٹ پہنتے ہیں، لمبے بال رکھتے ہیں اور لمبی ہانکتے ہیں۔ دُوسرے فوجیوں کو ایسی نزاکتوں کی اجازت نہیں لیکن رسالے والوں کے لیے یہ سب کچھ روایتاً جائز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اِن کے دَم سے ہی فوج کی سپاٹ زندگی میں کچھ آب و رنگ ہے۔ مَیں کہ سِگنل کور کا ایک خاکی پوش تھا، ایسے ہی خوش وضع افسروں سے گھِرا ہوا تھا۔ جے جی سنگھ، جوشی، حبیب اللہ، مُحمّد یعقوب، ارجن داس سنگھ اور بے شمار انگریز افسر۔

لیفٹیننٹ جے جی سنگھ نان سٹاپ باتیں کرتے تھے لیکن باتوں میں وُہ لذّت کہ جو اُس نے کہا۔ ہمارے دِل میں نکلا۔ جوشی بھی لیفٹیننٹ تھے۔ چھوٹے قد کی وجہ سے رسالے میں کسی قدر بے جا سے لگتے تھے، لیکن اپنی رنگین مزاجی سے وُہ معترضین کی توجہ قد کی طرف آنے ہی نہ دیتے تھے۔ جوشی کی یاد اُس غزل سے وابستہ رہے گی جو خورشید نے ایک نہایت ہی دل رُبا لَے میں گائی ہے اور جس کا مضمون ہم پردیسیوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ پہلا مِصرع تھا۔

"جو ہم پہ گُزرتی ہے ستاروں سے پوچھیے"[۴۵]

---

۴۵ وزنِ شعر بر گردنِ فلمی شاعر

جوشی ہر شب یہ ریکارڈ لگاتے اور جب ختم ہو چُکتا تو اپنی پُونا میں رہنے والی بیوی کی طرف اِشارہ کر کے کہتے کہ خُدا جانے سالی ستاروں سے سوال بھی کرتی ہے یا نہیں؟

کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی!

کیپٹن حبیب اللہ ببّل (BUBBLE) کہلاتے تھے۔ ہم سے سینئر تھے اور ذرا دماغی فاصلے پر رہتے تھے۔ خاصے انگریز مزاج تھے، لیکن رمضان میں دِن بھر کی فوجی مشقّت کے باوجود روزے رکھتے تھے۔ ارجن داس سنگھ اور یعقوب ہماری طرح سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ ہمارے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اِنہی نوالوں اور پیالوں کی خاطر ہم ہر شب کرنل صاحب سے آنکھ بچا کر گراپی یا بادیہ میں جانکلتے تھے۔

لیکن اِن سب میں سے دلچسپ آدمی کیپٹن رام ناتھ تھے۔ ابتدائے جنگ میں رسالدار تھے اور اگر جنگ نہ چھڑتی تو شاید رسالدار ہی جیتے اور مَرتے، لیکن جنگ کے فیضِ عام میں خانہ بر اندازانِ فوج نے آپ پر بھی کپتانی پھینک دی اور سَچ تو یہ ہے کہ ایسا کر کے آپ کا ستیاناس کر دیا یعنی ایک عظیم الشّان رسالدار کو ایک نہایت بے توفیقے افسر میں بدل دیا۔

رام ناتھ اپنے سرٹیفیکیٹوں کے علاوہ شکل وصورت سے بھی نیم خواندہ لگتے تھے۔ آپ کا کپتان ہونا نہ صرف آپ کے مزاج کے منافی تھا بلکہ غالباً قضا و قدر کے ابتدائی

منصوبے کے بھی خلاف تھا۔ آپ کسی کام میں بھی کپتانی کرتے تو آپ سے حوالداری ہو جاتی۔ پریڈ پر جاتے تو سپاہیوں پر دانت پیسنا شروع کر دیتے۔ وردی پہنتے تو سَر اور ٹوپی میں تسلّی بخش ربط نہ پیدا ہو سکتا۔ چائے پیتے تو ہونٹوں سے نہیں بلکہ پھیپھڑوں کے زور سے۔ پیالی ہونٹوں کے قریب جاتی، تو پھڑ پھڑانے لگتی اور خراد کی سی آوازیں آنے لگتیں۔ الغرض آپ چائے اُسی اصول پر پیتے جس پر جیٹ طیارے پرواز کرتے ہیں۔ سگریٹ پیتے تو پہلے اُسے مُٹھّی میں بھینچتے اور پھر آنکھیں بند کر کے کش لگاتے اور آنکھیں کھولنے تک اُسے راکھ کر دیتے۔ یہ دیکھ کر میں داغ کا مِصرع گُنگُناتا۔

"جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں"

اِس پر آپ فرماتے: "ملُوم ہندا اے ایہہ داگ وی سِر گٹ پیندا سی۔"

آپ نے کہیں سے سُن لیا تھا کہ افسری شراب پیے بغیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ سرِ شام اپنے کوارٹر کے باہر میز پر بوتل اور گلاس رکھ کر بیٹھ جاتے اور پینے سے پہلے ہی ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے اُن کے خیال میں مستی کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً ہوا یا ہٹلر کو مخاطب کر کے بڑی زرق برق مگر عام فہم گالیاں بکتے۔ اب پنجابی گالیاں بیشک توانا اور دُوررَس تخیل کی آئینہ دار ہوتی ہیں تاہم اُن سے مَستی سے زیادہ زبردستی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ مَے نوشی سے بھی رام ناتھ کی رام ناتھی ہی نِکھری، اُن کی کپتانی کا ملمع اُن کا

جزوِ بدن نہ ہو سکا۔

یہ نہیں کہ ہر وہ آدمی جو رینک سے ترقّی پا کر افسر بنا رام ناتھ تھا۔ جی نہیں، بے شمار افسر ایسے تھے جو سپاہی بھرتی ہوئے اور بعد میں افسری خود آپ کے اِستقبال کو آئی۔ وُہ اِس بات کو نہیں چھپاتے تھے کہ اُنہوں نے بطورِ سپاہی ابتدا کی۔ بلکہ کبھی ذکر کرتے تو اُن کے سپاہی رہنے پر رشک آتا، لیکن عام طور پر یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جوانی میں ہی افسری کی منزل عُبور کر لی تھی۔ رام ناتھ بہت بُوڑھے طوطے تھے اور اِس عُمر میں میاں مٹّھو سے زیادہ پیچیدہ بات کرنا اُن کے بَس کی بات نہ تھی۔

کرنل پیٹرسن کی تنک مزاجی کی وجہ سے عباسیہ کیمپ کی زندگی کافی پھیکی تھی۔ اچانک جرمنوں کو ہم پر رحم آیا اور اُنہوں نے ہمارے لیے رونق کا سامان پیدا کر دیا، یعنی ایک رات عباسیہ کے نواح میں ہوائی جہازوں سے فی البدیہہ دس بارہ بم پھینک دیے۔ اِس خیال سے کہ شاید جرمن اپنی چھاتہ فوج قاہرہ کے ہوائی اڈّے الماذا پر اُتارنا چاہتے ہیں، ہمیں راتوں رات الماذا کی حفاظت کے لیے باہر جانے کا حکم مِلا۔ حکم دینے والوں کے حق میں کلمۂ خیر سے مختلف کلمہ پڑھتے ہوئے بستر سے اُٹھے۔ وردی پہنی اور سارا کیمپ بیٹل آرڈر میں الماذا کی طرف بڑھا اور ایروڈروم کے گِرد خندقیں کھود کر مورچہ گیر ہو گیا۔

رات گُزر گئی، لیکن جرمن ہوائی جہاز نہ لوٹے۔ بہر حال ہمیں بتایا گیا کہ جرمنوں کا اِنتظار جاری رہے گا۔ رات تو کسی نہ کسی طرح تارے گِن کر گزار دی لیکن دِن بھر کا انتظار بڑا اگراں گُزرا۔ جرمنوں کو نہ آنا تھا نہ آئے لیکن انتظار ہفتہ بھر جاری رہا۔ وُہ عربی کہاوت ہے کہ اِنتظار مَوت سے بھی اشد ہوتا ہے۔ مَوت کا تو ہمیں بالفعل تجربہ نہ تھا، لیکن مزید انتظار سے بچنے کے لیے ہم اس تجربہ پر بھی تیار تھے۔ چنانچہ اِسی ہفتے کسی وقت اگر جرمن آجاتے تو ہم بے حد ممنون ہو کر اُن سے لڑتے اور مَرتے۔

آخر سات دن کے بعد کسی کو رحم آیا اور ہمیں حکم مِلا کہ رات اپنے کوارٹروں میں سو سکتے ہو لیکن صِرف آدھ گھنٹے کے نوٹس پر۔ گویا وردی پہن کر ہی بستر پر دراز ہونا تھا۔ ہمیں اِتنی رعایت بھی غنیمت تھی۔ ہمارے اکثر ساتھی سَچ مُچ وردی میں ہی سوئے، لیکن ہم نے ریشمی پاجامہ زیبِ تن کیا۔ نماز پڑھی اور ایک میٹھی نیند کی ابتدا کی لیکن کرنا خدا کا بلکہ جرمنوں کا کیا ہوا کہ اُسی رات الماذا پر پھر ہوائی حملہ ہوا۔ فی الفور الارم ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم پھر مورچوں میں تھے۔ یہ مورچوں میں بیٹھنا بھی قابلِ برداشت تھا لیکن الارم سُن کر بیدار ہونا، بستر سے جدا ہونا، ریشمی پاجامے کی جگہ خاکی وردی اور اُوپر چمڑا مع پٹھّو پہننا، کمر میں پستول لگانا اور سر پر آہنی خود رکھنا۔۔ سراسر ظلم تھا، جیو ہتھیا تھی۔

اِدھر اہلِ مِصر سمجھے کہ انگریز کے دِن گِنتی کے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھ کر "استجعل یا

رومیل" کا نعرہ لگانے لگے۔ انگریزوں نے قاہرہ کے بازاروں میں جا بجا روڈ بلاک لگا
لیے کہ رومل یا اُس کے متوسّلین اِدھر آ ہی نِکلیں تو اُن پر انگریزوں کی نارضامندی
واضح ہو جائے۔ جب اہلِ مِصر کو ذرا تیزی سے آزادی کے خواب آنے لگے، تو انگریز
اس لذّتِ خواب میں کسی قدر بد تمیزی سے مُخِل ہوئے۔ پانچ چار ٹینک شاہ فاروق کے
العابدین محل کے اِرد گرد کھڑے کر دیے اور شاہ موصوف کو ایک طشتری میں قلم رکھ
کر ایک لکیر پر دستخط کرنے کی زحمت دی۔ شاہ نے نیچے ٹینک دیکھے اور اُوپر جرمن
طیارے غائب پائے، تو دستخط کر دیئے اور بیک جنبشِ قلم ایک حقیر سے کاغذ کو تاریخ
میں اور ایک ناچیز سے قلم کو برٹش میوزیم میں جگہ دے دی۔ پھر انگریز کمانڈر سے ہاتھ
ملایا۔ اُسے وھسکی پیش کی اور اپنے وزیر اعظم علی ناصر پاشا کو الوداع کہی۔ انگریزوں نے
اپنی پسند کا وزیر فاروق کو پیش کیا اور اتفاق کی بات کہ فاروق کو نیا وزیر اعظم انگریزوں
سے بھی زیادہ پسند آیا!!

تاب لائے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آخر جنرل منٹگمری العالمین پہنچے اور جرمنوں کی توجہ اُدھر بٹ گئی۔ قاہرہ میں انگریز پھر
سَر اُٹھا کر چلنے لگے اور ہمارا کیمپ نئے سِرے سے اپنے کرنل صاحب کی کرم فرمائی کے

لیے محفوظ ہو گیا۔ اِس کرم سے تھوڑا سا حصّہ اِس خاکسار کو بھی مِلا اور وُہ یوں کہ ایک جیپ میں بیٹھا ہوائی اڈّے کو جارہا تھا کہ کیمپ کے دروازے پر کرنل صاحب مِل گئے۔ میں نے حسبِ معمول سلیوٹ کیا تو کرنل صاحب نے بکمالِ بندہ پروری نہ صرف سلام کا جواب دیا بلکہ جیپ کو ٹھہرا کر مجُھے "ہیلو خان" بھی کہا اور پُوچھا:

"کہاں جارہے ہو خان؟"

عرض کیا "ہوائی جہاز سے خاص ڈاک آرہی ہے۔ اُسے لینے جارہا ہوں؟"

مُسکرا کر بولے۔ "شاباش جہاز کس وقت آتا ہے؟"

عرض کیا "دس بجے"

بولے "نہیں گیارہ بجے۔"

میں نے اَدب سے کہا "شاید آپ کو یاد نہ ہو دس بجے ہی آتا ہے۔"

اِس کے بعد وہی ہوا جو شدنی تھا۔ کرنل صاحب نے جوش میں آکر اپنی ٹوپی زمین پر دے ماری اور جیپ کو اپنی چھڑی سے ضرب لگا کر بولے:

"دس نہیں گیارہ بجے آتا ہے۔"

ظاہر تھا کہ اب شعلے بلند ہوں گے لیکن پیشتر اِس کے کہ مالی والی تاریخ دہرائی جاتی ڈرائیور نے زبان نکال کر کرنل صاحب کا مُنہ چڑایا، ایکسلریٹر کو دبایا اور جیپ فرّاٹے بھرتے ہوئے نکل گئی۔ جواب میں کرنل صاحب نے ہم پر تو دانت پیسے، لیکن ڈرائیور کی بدتمیزی پر ہنس دیے اور انہیں ہنسنا ہی چاہیے تھا کیونکہ ہمارا ڈرائیور کوئی سپاہی لہنا سنگھ نہ تھا بلکہ نہایت ہی شوخ و شنگ اے ٹی ایس لڑکی مِس مارگریٹ تھی اور کرنل صاحب ہر چند کہ سَر کے کھوکھلے تھے، سینے میں دِل رکھتے تھے۔

بہرحال ہمارا قصور معاف ہونے والا نہ تھا اور نہ ہی ہم مستقل طور پر مارگریٹ کی حفاظت میں رہ سکتے تھے؛ چنانچہ ہم آنے والے طوفان کے اِنتظار میں بیٹھ گئے، مگر دُوسرے ہی روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری زندگی میں تو ایک اِنقلاب سا برپا کر دیا، لیکن کرنل صاحب نے بھی اس میں حِصّہ لے لیا اور بقول لاہوریاں: "بدو بدی"

واقعہ یہ ہوا کہ قاہرہ کے مشرقی مضافات میں جنہیں "المعادی" کہتے ہیں، رائل سِگنل کور کا ایک بہت بڑا کیمپ اور سکول تھا۔ اِسی سکول کے اِنڈین وِنگ کے افسر کمانڈنگ کیپٹن اُوڑا سنگھ [۴۶] تھے۔ اتّفاق سے اُن کی وطن کو واپسی کا وقت قریب آ گیا اور جی ایچ کیو مڈل ایسٹ (قاہرہ) کو اُن کے جانشین کی

---

[۴۶] اصل نام ذرا مختلف تھا۔

حاجت محسوس ہوئی۔ اِسی تلاش میں عباسیہ کیمپ سے فون پر پُوچھا گیا کہ اگر سِگنل کور کا کوئی موزوں افسر ہو تو اس کا نام پتہ بتاؤ۔ فون لینے والے کیمپ کے ایڈ جوڈنٹ کیپٹن بنگو تھے اور ہمارے یار تھے۔ جواب میں بولے۔

"بڑا موزوں آدمی ہے لیکن ہے ذرا سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی۔ کوئی ڈیڑھ سال سروس ہے۔"

اُدھر جی ایچ کیو کے فون پر کوئی حاتم طائی بیٹھا تھا۔ بولا "اگر موزوں ہے تو سروس کی فِکر مت کرو۔ ہم کپتانی دیں گے لیکن اُس سے کہو کہ معادی جا کر سِگنل سکول کے کرنل سے اپنی موزوئیت کی تصدیق کرا لائے۔ اگر کرنل صاحب نے ہاں کر دی تو ہم کل اُس کے تقرّر کا حکم بھیج دیں گے۔"

بِنگو نے یہ سُنا تو بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چھٹی دے کر ہمیں معادی کیمپ کے کمان افسر کرنل جورڈین کے پاس بھیج دیا۔ بِنگو اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ معاملہ کرنل پیٹرسن سے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ ورنہ ہماری کپتانی کے بِن کھلے ہی مُرجھا جانے کا اندیشہ تھا۔

معادی میں کرنل جورڈین سے مُلاقات ہوئی تو بڑے شفیق سے بزرگ نکلے۔ اس بات سے خاص طور پر متاثر ہوئے کہ سِگنل کور کا ایک افسر رسالے کے کیمپ میں ضائع ہو رہا

ہے۔ بولے:

"حکم ملتے ہی یہاں آ جاؤ۔"

ظاہر تھا کہ کرنل صاحب کی نِگاہ میں ہم موزوں ہیں۔ چنانچہ دُوسرے روز سچ مُچ ہمارے نئے تقرّر اور کپتانی کا حکم آ گیا۔ بِنگو نے کرنل پیٹرسن سے بالا بالا ہمیں موومنٹ آرڈر دے دیا۔ مارگریٹ بھی ہماری سازش میں شریک ہو گئی۔ چپکے سے جیپ لے آئی۔ ہمیں اور ہمارے اسباب کو لاد کر معادی پہنچا دیا۔ مارگریٹ کو الوداع کہی تو کسی قدر رنج سا ہوا، لیکن دوسرے روز جب معادی کی کھلی فضا میں سانس لیا تو ہماری دنیا لاکھوں مارگریٹوں کے تبسّم سے معمور ہو گئی۔

جب کندھوں پر کپتانی لگائی اور کیپٹن اُوڑا سنگھ سے اِنڈین وِنگ کی کمان سنبھالی تو ہمیں معاً جنرل منٹگمری کا خیال آیا کہ انہیں بھی پچھلے دنوں ہی آٹھویں فوج کی کمان دے کر العالمین بھیجا گیا تھا۔ یعنی ذمہ داریاں بھی ایک جیسی ہی تھیں۔ ذرا سا درجے کا فرق تھا۔ بڑی پھُرتی سے اپنے دوستوں کو وطن میں خط لکھّے جن کا مُدعا فقط یہ تھا کہ اب ہم محض نیم لفٹین نہیں بلکہ ہمارے کندھوں پر تین تین پھول کِھل اُٹھے ہیں۔ بارہا تنہائی میں اپنے شانوں کو دیکھا۔ ستاروں کی کثرت سے کہکشاں نظر آتے تھے۔ حتّٰی کہ آنکھوں میں چکا چوند سی آنے لگی اور گردن میں بَل پڑنے لگے۔

اَب تو با قاعدہ اپنا یونٹ تھا اور ہم آفیسر کمانڈنگ۔ گویا سیاں کے محتاج نہ تھے۔ خود کوتوال تھے۔ سوڈر کس کا؟ کہ تھوڑی سی بے قاعدگی کر کے بھی دیکھ لی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ یہاں کسی پیٹرسن کا خوف نہ تھا۔ جدھر جاتے سینکڑوں بازو سلیوٹ میں اُٹھ جاتے۔ محسوس ہوتا کہ دیکھنے والے رَشک کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم دِل ہی دِل میں ہر سلیوٹ کرنے والے کو دُعا بھی دیتے کہ نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو۔ پھر آرڈرلی روم ہوتا یعنی ماتحتوں کی شکایات اور فریادیں سُننے کے لیے دربار لگتا۔ پھر سرکاری ڈاک دیکھتے اور جی چاہتا تو کوئی خط پڑھ بھی لیتے۔ پھر ٹیلیفون پر لوگوں سے ضروری اور غیر ضروری باتیں مِلا جلا کر کرتے۔ ہمیں یقین تھا کہ افسری میں کچھ مَزا ہے تو ہم لُوٹ رہے ہیں۔ یہ لُوٹ کوئی ہفتہ بھر جاری رہی تا آنکہ اچانک بنگو کا عباسیہ سے فون آیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا:

”غضب ہو گیا۔ کرنل پیٹرسن کو تمہارے جانے کا پتہ چل گیا ہے، سخت برہم ہے۔ جو اندر جاتا ہے اُسے پیپر ویٹ کھینچ مارتا ہے۔ تمہارے متعلق جی ایچ کیو کو لکھ رہا ہے کہ کپتانی کے قابل نہیں۔ ایسے مزید تجربہ حاصل کرنے کے لیے فی الفور محاذِ جنگ پر بھیجا جائے۔ اب تم جلد ہی جی ایچ کیو سے سُن لو گے۔ ساری اولڈ بوائے۔“

یعنی ہماری حالت کچھ فیض سے مِلتی جلتی تھی:

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ایک لمحے کے لیے ہمارے کاندھوں کی کہکشاں مع کپتانی کے ماند پڑ گئی اور ہمارے تصوّر میں سیدی رزیغ، جرمن گولے اور بُلی بِیف آنمودار ہوئے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

قریب تھا کہ ہم لڑکھڑا جائیں لیکن ایک بزرگ کا قول یاد آیا کہ اگر مصیبت آجائے تو اُس شخص کا خیال کرو جو تم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہو۔ اِس ضمن میں موزوں ترین شخص نظام سقّہ ہی تھا، جس نے فقط آٹھ پہر کی سریر آرائی کے بعد آرام سے مشک اُٹھا کر چھڑکاؤ شروع کر دیا تھا اور ہم تو خیر سے متواتر آٹھ دِن سے کپتان تھے۔ خُدا کا شکر ادا کیا اور ذرا کا پیتی کپتانی بھی بدستور جاری رکھی لیکن حسبِ توقع دُوسرے دن کرنل جورڈین کا اردلی سلام لے کر آیا۔ اُن کے دفتر میں گیا تو کرنل صاحب نے ایک کاغذ ہماری طرف بڑھایا۔ یہ جی ایچ کیو کا خط تھا۔ پڑھا تو وہی کچھ لکھا تھا جو بِنگو نے بتایا تھا۔ رُکتے رُکتے پوچھا:

"مُجھے کب محاذ پر جانا ہے؟"

کرنل جورڈین میرے سوال پر مُسکرائے اور ایک دوسرا کاغذ میری طرف سرکایا۔ یہ

جی ایچ کیو کو اُن کی طرف سے جواب جارہا تھا۔ لِکھّا تھا:

”یہ افسر میرے ماتحت کام کرتا ہے۔ کپتانی کے لیے موزوں ہے یا نہیں اِس کا فیصلہ مُجھ پر ہے اور وُہ یہ ہے کہ موزوں ہے۔ عباسیہ کیمپ کے کرنل صاحب کو میری طرف سے بعد از آداب بتایا جائے کہ دُوسرے یونٹ کے افسروں پر رائے زنی کرنا فوج کا دستور نہیں۔“

ہمارے دماغ سے سیدی رزیع، جرمن گولے اور بُلّی بِیف یک قلم غائب ہو گئے اور واپس اِنڈین وِنگ میں جا کر ہم نہایت شان و شدّت سے کپتانی کرنے لگے جو نظام سقّے کی سریر آرائی سے کہیں زیادہ کھری اور دیرپا تھی۔

سُنا ہے چند دن بعد جب کرنل پیٹرسن کو جی ایچ کیو سے جواب گیا تو موصوف نے اپنا ہیٹ اُتار کر پٹخنے کی بجائے کھالیا! ہڑپ کر کے نہیں لُقمہ لُقمہ! واللہ اعلم بالصواب۔

مِڈل ایسٹ سِگنل سکول معادی (قاہرہ) میں

صحرا کی لڑائی اور عباسیہ کی "مار کٹائی" کے بعد معادی کی زندگی ایک خواب کی طرح سُہانی زندگی تھی۔ صُبح سے دوپہر تک وِنگ کا سرکاری کام جو یوں تو شاید ایسا سُبک محسوس نہ ہوتا۔ لیکن خود اپنا باس ہونے کی وجہ سے ایک ولولہ انگیز تفریح بن گیا اور دوپہر کے بعد تو بس ہم تھے اور قاہرہ۔ معادی کے اسٹیشن سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک مکلّف ڈیزل ٹرین چلتی جو دس منٹ میں قاہرہ کے مرکز یعنی بابِ لُوق اسٹیشن پر پہنچادیتی اور پھر ہم قاہرہ کی وُسعتوں میں کھو جاتے۔

قاہرہ نوردی اِس اعتبار سے دو آتشہ ہو گئی تھی کہ لیفٹینٹ پی سی ورما جو مہو میں ہمارے ہم جماعت تھے اچانک ایک دن معادی میں آن وارد ہوئے۔ یہ بھی سِگنل افسر تھے اور محاذ پر ایک بریگیڈ کے ساتھ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کے ذرا اُونچی آواز سے حامی تھے جو اُن کے انگریز کمانڈر کو موافق نہ تھا؛ چنانچہ انہیں میدانِ جنگ میں خطرناک

سمجھ کر واپس کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ایسا کر کے بر گیڈ ئیر صاحب نے بڑا کارِ ثواب کیا کہ میں معادی میں ہر چند کہ خوش تھا، تنہا دیسی افسر تھا اور ورما سے زیادہ انجمن آرار فیق مِلنا مُشکل تھا۔ ورما کسی قدر زیرِ عتاب تھا لہٰذا اُسے کوئی سرکاری کام نہیں دیا گیا تھا۔ اُس کا واحد شُغل ہر شام قاہرہ کے کسی مقام پر انجمن آراستہ کرنا تھا۔ کبھی بادیہ یا گراپی میں، کبھی شیپرڈ یا کانٹی نینٹل ہوٹل میں، کبھی اِنڈین کلب یا جزیرہ کلب میں اور کبھی انکل "ن" کے یہاں یا بھابھی للّی کے کلب میں۔۔۔ اِن اجنبی ناموں سے تعارف ابھی تھوڑی دیر میں ہو گا۔

ورما کم بخت نہایت خوش شکل اور شگفتہ مزاج نوجوان تھا۔ کلارک گیبل سے خطرناک حد تک مشابہت رکھتا تھا۔ کچھ خداداد اور باقی اُس کی اپنی پیدا کردہ، یعنی وُہ پتلی لمبی لکیر سی مُونچھ اور وُہ نیم بد معاشانہ سی ہنسی جس میں ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ مُسکراتی ہیں۔ ورما کی آنکھوں میں ایک شریر اور دلکش سی چمک تھی۔ وُہ جہاں سے گُزر جاتا، عورتیں دوبارہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

ایک روز گراپی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک خاتُون کچّے دھاگے سے کھچی کھچی آئی اور ورما سے کہنے لگی۔:

"تم کلارک گیبل ہو؟"

ورما تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا اور وُہی چشم ولب کی مُسکراہٹ کا متحدہ محاذ بنا کر بولا:

"اِس کے متعلق تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، یہ ہے کہ آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔"

ساتھ ہی ورما نے خاتُون کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ محترمہ بیٹھ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ورما کو دیکھ کر اُن کی مرادیں پُوری ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بیچاری چار دن سے ورما سے کلام کرنے کی تمنّا میں چکرائی پھرتی رہی ہیں اور ارادے باندھی اور توڑتی رہی ہیں۔ اور آج کشتی خُدا پر چھوڑ کر منجدھار میں اُتر آئی ہیں۔ ورما نے اُنہیں اپنی خوش کلامی سے کنارے پر لا کھڑا کیا اور وُہ دعا دیتی رخصت ہو گئیں۔۔۔۔ ورما کی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے اور اُس نے بیسیوں لڑکیوں سے اپنی غلامی کے پیمان باندھے، لیکن اپنی ہرجائی محبّت کا پول نہ کھُلنے دیا۔ سوائے ایک نازک موقع کے جس کا ذکر آنے والا ہے۔

ان دنوں قاہرہ میں دیسی افسروں خصوصاً ڈاکٹروں کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں سے ایک میجر وید پرکاش تھے۔ وید، ورما کی ضد تھے۔ سپاٹ چہرہ جو کسی ایکٹر سے مشابہ نہ

تھا۔ مُونچھ سیدھی سادی شریفانہ بلکہ کسی قدر رلالانہ یعنی کونوں پر مائل پستی۔ رہا عِشق تو بے حد یکجائی۔ ایک جگہ ابتدا کی اور پھر وہیں انتہا کر دی یعنی شادی کر لی۔ ہم وید کی شادی میں شریک ہوئے اور نتیجہ یہ نِکلا کہ قاہرہ کی زنانہ کلب کا جزوِ بدن بن گئے۔

بات یہ تھی کہ ہماری بھابھی للّی جو ایک معزّز قبطی خاندان کی بیٹی تھیں، خواتین کلب قاہرہ کی سیکرٹری تھیں۔ یہ کلب کمال پاشا چوک میں ایک وسیع عمارت میں واقع تھا۔ قاہرہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی بیشتر خواتین اس کی ممبر تھیں۔ ہم وید کے شہ بالے تھے اور سکتر کے دیور لہٰذا بے باکانہ آتے جاتے تھے۔ بھابھی للّی کی بیسیوں سہیلیوں سے بے تکلّفی ہو گئی تھی۔ ان میں عیسائی بھی تھیں اور مُسلمان بھی۔ سب معزّز گھرانوں سے تھیں اور ایک سے ایک خوش وضع اور خوش پوش۔ لہٰذا وید کو اور مُجھے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ ورما کوئی گُل نہ کھلائے۔ احتیاطاً ہم نے ورما کو قسم کھلائی جو اُس نے ہکلائے بغیر کھا لی، لیکن ورما کا اپنا دِل پابند قسم سہی، حسین و جمیل روزی کے دِل پر تو کسی کو اختیار نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن روزی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پہلو سے دِل نکال کر ورما کے ہاتھ پر رکھ دیا اور جذبات سے مجبور ہو کر اُسے بھری مجلس میں کہہ دیا۔

"مجھے تُم سے محبّت ہے اور سخت محبّت ہے۔"

ہم نے مذاق میں اُڑانے کی کوشش کی تو روزی نے اپنا دامن اشکوں سے بھر لیا۔ ہم نے

بھابھی للّی سے رجوع کیا تو روزی کا علاج یہ طے پایا کہ ورما "یکے از معشوقات" کو روزی کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تاکہ روزی ورما کو دِل سے باہر نکال مارے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ ٹوٹکا کامیاب ثابت ہوا اور روزی تیزی سے رُوبصحت ہونے لگی۔

خواتین کی کلب نے ہمیں قاہرہ کے کئی اونچ گھرانوں سے متعارف کرایا۔ ہمیں خصوصاً مِصری پاشا کا گھر کبھی نہ بھُولے گا جن کے خوبصورت وِلّا واقع ہلیاپولس میں جانے کا کئی مرتبہ اتّفاق ہوا۔ اُن کی دو بیٹیاں حسن و عفّت کی تصویریں تھیں۔ ہمیں ماننا پڑا کہ ہر چند کہ نچلے طبقے کے اخلاق جنگ کی نذر ہو گئے تھے، اکثر اعلیٰ گھرانوں میں وہی پرانی قدریں تھیں۔ اُن کی بہو بیٹیاں طرحدار بھی تھیں اور وضع دار بھی۔ اُن کی ہم نشینی سے ایمان میں گڑبڑ کی بجائے تازگی آتی تھی۔ اُن میں سے اکثر کالجوں میں پڑھتی تھیں۔ ہم سے گھنٹوں گرما گرم بحث کرتیں اور اپنی ملائم سی انگریزی میں (جس میں ٹٹ بٹ، تت بت ہو جاتا ہے) بے حد لبھاتیں، لیکن اُن کے سامنے ورما تک دَم نہ مارتا۔

ایک دِن لاہور سے ہمیں اپنے ایک بزرگ نے خط میں لکھا کہ میرے ایک جگری دوست میجر "ن" قاہرہ میں جنرل ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وُہ بھی تمہارے چچا ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے اُن سے مِلو اور پھر مِلتے رہا کرو کہ بہت نیک آدمی ہیں۔ اب بہت نیک آدمیوں سے گولی کی سی تیزی سے جا مِلنا گُستاخی ہوتی ہے، لہٰذا میں

نے تعمیلِ ارشاد میں کچھ دیر کر دی تو اگلے خط میں لاہور سے ڈانٹ آئی کہ چچا جان سے مِلنے میں تامل کیوں؟ وطن میں تو تُم خاصے سعادت مند بیٹے تھے۔ معلوم ہوتا ہے قاہرہ میں تمہاری صحبت کچھ ٹھیک نہیں۔ چچا جان سے بِلا توقّف مِلو۔

ورما سے ذکر کیا تو بولا: ''ٹھیک ہے۔ پچھلے پہر چچا جان کے پاس جانا اور اُن کے ساتھ شام کی نماز پڑھ کر گر اپی آ جانا۔''

میں نے کہا۔ ''وُہ شاید تہجد کے لیے بھی ٹھہرا لیں۔ چلو اکٹھے چلتے ہیں۔ تمہارے بہانے رخصت جلد مِل جائے گی۔''

ہمارے ایک دوست میجر لال اِتفاق سے انکل ''ن'' کو پہچانتے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر اُنہیں بھی ساتھ لے لیا۔ چلنے سے پہلے چچا جان کو فون کر دیا کہ میرے ساتھ دو دوست بھی ہوں گے۔

انکل ''ن'' نے قاہرہ کے ایک گنجان حِصّے میں پانچویں منزل پر فلیٹ لے رکھا تھا۔ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہو گئی اور کوئی رات کے آٹھ بجے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُن کے دروازے پر جا دستک دی۔ ایک وقفے کے بعد دروازہ کھُلا۔ ہمارے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ململ کے کرتے اور ریشمی لُنگی میں ملبوس کھڑا تھا۔ پاؤں میں پوٹھوہاری زری جوتا اور سر سے ننگا۔

میجر لال آہستہ سے بولے۔ ”یہی انکل 'ن' ہیں۔“

میں نے برخوردارانہ لہجے میں اپنا اور دوستوں کا تعارف کرایا۔ جواب میں انکل نے ہم تینوں کو اپنے دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا اور اندر لے چلے۔ ایک گیلری سے گزرے جس کے سِرے پر دروازہ تھا۔ انکل نے دروازہ کھولا تو ہمیں کمرہ اور اُس کی آرائش نظر آئی۔

قاری محترم۔ ذرا پوچھیں کہ ہم نے اپنے نیک چچا کے ڈرائنگ روم میں کیا دیکھا۔ جائے نماز؟ تسبیح؟ کیا اُنھوں نے دیواروں پر اسلامی قطعات لگا رکھے تھے کہ روزِ محشر کہ جاں گداز بود۔ اوّلیں پرسش نماز بود؟ یا وہاں الماریاں دھری تھیں جن میں عِلم و حکمت کے موتی یعنی ہمارے آباء کی کتابیں رکھی تھیں؟ جی نہیں۔ اِس کمرے کا نقشہ کسی قدر مختلف تھا۔ سارے فرش پر دیواروں تک ایرانی قالین بچھا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں ایک براق چاندنی بچھی تھی جس کے گرد گاؤ تکیے رکھے تھے اور مرکز میں بلّور کی کھُلے مُنہ کی صراحی پڑی تھی جس میں چار نرم و نازک ہاتھ ایک مائع گِرا رہے تھے۔ یہ مائع بیئر اور جنجر کی بوتلوں سے نِکل کر شینڈی میں تبدیل ہو رہا تھا اور انڈیلنے والے ہاتھ چار حسین لڑکیوں کے تھے جن کے چہروں پر تو تبسّم تھا لیکن بدن پر کچھ نہ تھا۔ مہمانوں کو دیکھ کر تعظیماً اُٹھیں، اہلاً و سہلاً کہا۔ با ادب ایک ایک مہمان کا بازو تھام کر اُسے گاؤ تکیہ کے ساتھ بٹھایا یا لِٹایا اور پھر صراحی سے لبالب جام بھر کر پیش کیا۔

اِس اثنا میں میری برخورداری پسینہ کی صورت پھُوٹ پھُوٹ کر بہہ رہی تھی۔ معاً میری نِگاہ انکل پر پڑی، لیکن اب وُہ مہمانوں سے غافل ہو چکے تھے اور اپنے ساقی سے جام پر جام طلب کیے جا رہے تھے۔ انکل کوئی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے۔ ایک جرعہ پیتے اور شعر دُہراتے:

گر چہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر نگاہ ز کنارِ تو جواں برخیزم

میں نے اپنے نیک انکل کو سرگرمِ عمل دیکھا تو میرا پسینہ اور تیز ہو گیا۔ میں نے "اپنی" دُشمن ایمان و آگہی کے کان میں کہا کہ اگر ہو سکے تو مجھے تھوڑا سا لیمن سکواش پلا دو۔ ورنہ ساغر کو مِرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مَیں۔ لیکن عُمر خیام کے گھر میں لیمن سکواش کا کیا کام؟ جب سحر ہوئی تو انکل ابھی نہ جوان ہو پائے تھے اور نہ اُن کے جاگنے کے ہی آثار تھے۔ چنانچہ انہیں بساطِ ہوائے دِل پر ہی لیٹے چھوڑ کر ہم کیمپ کو سدھارے اور کیمپ میں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ لاہور والے انکل کو خط لکھا کہ ہم نے اپنی نالائقی کی تلافی کر دی ہے اور انکل "ن" کی ملاقات کی سعادت سے عاقبت سنوار لی ہے۔ چند روز کے بعد لاہور سے جواب آیا کہ شاباش جیتے رہو۔ ہم نہ کہتے تھے کہ صحبتِ صالح ترا صالح کند۔۔۔۔

انکل ”ن“ سے تو ہماری پہلی ملاقات آخری ثابت ہوئی لیکن معادی سے ہر روز قاہرہ جا ہی نکلے تھے کیونکہ معادی میں انڈین وِنگ کی زندگی کی رفتار ایک نرم خرام ندّی کی مانند تھی جس کی سطح پر کوئی بُلبُلا نہ اُبھرتا تھا اور سچّی بات ہے ایسی بے بُلبُلا زندگی ہمارے مزاج کو راس نہ تھی لیکن اچانک ایک دِن انڈین وِنگ کی خاموش زندگی میں ایک بُلبُلا نہیں ایک غلغلہ پیدا ہوا اور ہمیں قاہرہ جانے کی نہ حاجت رہی اور نہ ہوش۔ کوئی دس بجے کے قریب اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کرنل صاحب نے فون پر اپنے دفتر میں طلب کیا۔ کرنل صاحب کی آواز میں واضح اضطراب تھا۔ حاضر ہوا تو مُجھے سامنے بٹھا کر سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے:

”کل شام ایک انگریز کارپورل اور ایک انگریز لڑکی معادی کلب کے قریب باغ میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے کارپورل کو پستول کا نشانہ بنا دیا۔ آج صُبح کارپورل ہسپتال میں مر گیا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ قاتل شکل و صُورت سے ہندوستانی نظر آتا تھا اور اس کے پاس اطالوی ساخت کا خود کار پستول تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاتل تمہارے وِنگ کا جوان ہو۔ ابھی جا کر اپنے جوانوں کو میدان میں ”فال اِن کرو۔“ میں دس منٹ میں لڑکی کو لے کر آتا ہوں۔ وُہ قاتل کی شناخت کرے گی اور شناخت کے بعد انڈین وِنگ کے خیموں کی تلاشی بھی لی جائے گی کہ شاید پستول برآمد ہو سکے۔“

یہ سُن کر اُٹھا تو مُجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کِھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ نہیں کہ

اس بد قسمت کارپورل کی تفریح میں مُخل ہونے والے ہم خود تھے بلکہ اس لیے کہ جس پستول سے یہ بدتمیزی کی گئی تھی اُسی ساخت اور حُلیے کا پستول ہمارے خیمے میں بھی پڑا تھا۔۔۔ آپ کا اِس پستول سے تعارف ہو چُکا ہے۔۔۔ اور عین ممکن تھا کہ دُوسرے خیموں کے ساتھ ہمارے خیمے کی تلاشی بھی لی جاتی۔

کرنل صاحب کے دفتر سے نِکلا تو اپنے وِنگ تک آتے آتے تجویزیں بناتا اور ڈھاتا رہا:

پستول کو نکال کر باہر ریت میں دفن کر دوں؟ نہیں کوئی دیکھ لے گا۔

نزدیک کے کنوئیں میں پھینک دوں؟ نہیں کوئی سُن لے گا۔

اپنے دفتر میں الماری کے نیچے رکھ دوں؟ نہیں کوئی سُونگھ لے گا۔

پستول بالکل چھوٹا سا تھا، لیکن اگر سوئی کے برابر بھی ہوتا تو اضطرار میں اُس کے تسلّی بخش چھپاؤ کی کوئی تجویز ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ بہر حال سیدھا خیمے میں پہنچا۔ پستول نِکالا۔ سلیمانی ٹوپی کی بے پناہ ضرورت محسوس کی کہ پستول کو پہنا کر سامنے میز پر رکھ دوں اور کوئی دیکھ نہ پائے۔ شناختی پریڈ کا وقت قریب تھا اور کچھ نہ سُوجھی تو پستول کو اپنی نکّر کی جیب میں ڈال لیا اور شناخت کے لیے چل پڑا۔

وِنگ کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی تین قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور اتنے میں کرنل

صاحب مع شناخت کنندہ حسینہ کے ٹکڑے سے نمودار ہوئے۔ ہم بحیثیت او۔سی اُن کے استقبال کو ذرا آگے بڑھے اور معاً خیال آیا کہ ہم افسر سہی لیکن ہندوستانی ہیں اور کسی نہ کسی زاویے سے قاتل سے ضرور مشابہ ہوں گے۔ ناک اور کان بالعموم ہر ہندوستانی کے ایک سانچے کے ہوتے ہیں اور ہم ہی پہلے ہندوستانی ہیں جن پر اس نیک بخت کی نِگاہ پڑے گی۔ اگر اُس نے کہہ دیا کہ قاتل سے کچھ مِلتا جلتا ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس کے بعد مزید ثبوت کے لیے ہمارے خیمے کی نہیں، بلکہ ہماری جیب کی تلاشی کافی ہو گی۔

جی چاہتا کہ کاش، استقبال کے دوران لڑکی سے علیک سلیک بھی ہو جائے مگر ہمارے چہرے پر نِگاہ نہ ڈالے یعنی ہمارے چہرے سے کچھ ایسا جلال برسے کہ اُس کی دید کی تاب نہ لا سکے اور گردن سے اُوپر آنکھ نہ اُٹھائے، لیکن جب قریب پہنچا تو اِس بے باک فرنگن نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارے اندر کے راز بھی پا لیے۔ ظاہر تھا کہ ہمارے چہرے سے ابھی جلال کی بارش شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن ادھر شناختی پریڈ شروع ہو گئی۔

لیڈی کے ساتھ ساتھ ہم بھی جوانوں کے سامنے سے گُزر رہے تھے، لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ پستول جیب پھاڑ کر نیچے گرنے کو ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول تھام سکتا تھا، لیکن کرنل صاحب کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالنا بد تمیزی تھی؛ چنانچہ جب تک پریڈ ختم نہ ہوئی ہم اپنی جیب کی اِستقامت کی دُعائیں مانگتے رہے جو بالآخر مستجاب

ہوئیں۔ کیونکہ پریڈ ختم ہوئی تو ہمارے جوان بے گناہ ثابت ہوئے۔ خیموں کی تلاشی بھی ناکام رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اسقاطِ جیب کی شرمندگی سے بچ گئے۔ کوئی دس دن بعد قاتل کسی دُوسری جگہ سے پکڑا گیا تو ہم نے اپنے بے گناہ پستول کو جو ناحق انڈر گراؤنڈ زندگی گزار رہا تھا، روشناسِ خلق کیا اور اُسے ٹوپی پہنائے بغیر ڈنکے کی چوٹ میز پر رکھ دیا۔

قاہرہ۔ آخری ایام

۱۹۴۳ء میں اِدھر ہم معادی میں اِنڈین وِنگ کی کمان پر چھا رہے تھے اور اُدھر لیبیا میں لارڈ منٹگمری جرمنوں اور اطالویوں کو بھگا رہے تھے اور ہانکتے ہانکتے انہیں تیونس اور بزرتہ تک لے گئے تھے۔ آگے سمندر تھا۔ سمجھدار اطالویوں نے سمندر میں کود پڑنے کی بجائے پیچھے دیکھا اور ہاتھ بلند کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مِصر میں بیسیوں قیدی کیمپ اسیروں سے بھر گئے۔ ایک کیمپ ہمارے قریب بلکہ بالکل ہمارے سایۂ عاطفت میں کھولا گیا جہاں سے اطالوی سپاہی ہماری خدمت کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ پرائیویٹ برزینی کو ہمارے خیمے اور اس کے مضافات کی تزئین کی ڈیوٹی ملی۔ یہی ڈیوٹی ہمارا مستقل اردلی سپاہی مُحمّد اقبال بھی کرتا تھا اور ہزار دِل سے، مگر اس کا اندازِ کار کچھ دہقانی سا تھا۔ جب

برزینی کی آرائشِ خیمہ دیکھی تو دنگ رہ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خود لیونارڈوڈاونچی نے آکر ہمارے خیمے کی مونالِزا بنا گیا ہو۔ برزینی کی چابکدستی کی تحسین ہم نے وافر سگرٹوں سے کی جو جنگی قیدیوں کے لیے ایک نایاب نعمت تھے۔ چند روز گُزرے تو برزینی نے ہمیں دِلکش سا سگریٹ لائٹر پیش کیا۔ ہم نے "نہ، نہ، نہ" کی زنجیر کے ساتھ بشکریہ واپس کیا تو برزینی آرام سے کہنے لگا:

"لے لیجیے، میں نے آپ ہی کی خاطر بنایا ہے۔"

مَیں نے حیرت سے پُوچھا: "تُم نے خود بنایا ہے؟ یہ تو رانسن کے کارخانے کا معلوم ہوتا ہے۔"

بولا "رانسن مشین سے بناتا ہے، میں نے اپنے ہاتھ اور اپنی ہتھوڑی سے بنایا ہے۔"

برزینی ایک ہنر مند نوجوان تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ ہر اطالوی سپاہی کسی نہ کسی ہنر میں ماہر ہوتا ہے۔ اطالوی سپاہیوں کا یہ معیار دیکھ کر اپنے سپاہیوں کا خیال آیا جو اکثر فنونِ لطیفہ کو چھوئے بغیر ہی بالغ ہو جاتے ہیں، لیکن سوچا کہ ایسا ہونا بُرا بھی نہیں۔ اگر فنونِ لطیفہ ہی ہمارے سپاہیوں کے لیے ذریعۂ عزّت ہوتے تو آج دشمن افسروں کے لیے سگریٹ لائٹر تیار کر رہے ہوتے۔ سپاہی کا پہلا کام لڑنا اور دُشمن کے ساتھ وُہ

سلوک کرنا ہے کہ سگریٹ تو کیا، پانی تک نہ مانگے اور اِس ہنر میں سپاہی بہادر خاں اور نائک پہلوان خاں یکتا تھے اور ہیں۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں جنگ افریقہ سے نِکل کر اٹلی جا داخل ہوئی تھی اور برزینی کے وطن کی حالت خاصی پتلی تھی۔ البتّہ جرمن بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے اور ہٹلر مسولینی کو کندھے پر اٹھا کر اہلِ روم کو بتا رہا تھا کہ تمہارا اِل ڈیوچے ہمارے ساتھ ہے لیکن اطالوی اب ہر قیمت پر امن اور سوّیوں کے لیے بیتاب تھے؛ چنانچہ ایک دن اچانک اطالوی فوجوں نے ہٹلر سے آنکھ بچا کر قرینے سے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ خبر ہم تک ایک عجیب انداز میں پہنچی۔

اُس شام ہمارے میس میں بڑا ڈنر تھا۔ کوئی سو سے زیادہ افسر کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ رسمی ڈنر تھا، خاموشی تھی اور افسریوں تن کر بیٹھے تھے کہ کپڑوں کے علاوہ جسم کو بھی کلف لگا کر آ گئے ہوں۔ اچانک ساتھ کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کسی بیرے نے فون لیا تو دُوسری طرف سے مطالبہ ہوا کہ کوئی افسر آ کر بات کرے۔ مَیں دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ اُٹھا اور جا کر ریسیور کان سے لگایا۔ ایک ہیجان خیز سی آواز سُنائی دی۔ بولنے والے کیپٹن جارج تھے۔ ہمارے کیمپ کے ڈیوٹی افسر۔ مُجھے پہچان کر کہنے لگے:

"خبر سُنی ہے؟"

"کون سی خبر"؟

"تو پھر نہیں سُنی اور سُنو:

"OLD MUSS HAS HAD IT"[47]

پھر تشریحاً بتایا کہ اٹلی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ذرا ڈائننگ ہال میں اِعلان کر دو۔ مَیں ہال میں واپس آیا تو دروازے میں کھڑے ہو کر دانستہ طور پر ذرا ڈرامائی انداز میں بولا:

"حضرات توجہ! ابھی ابھی ڈیوٹی افسر نے خبر دی ہے کہ اٹلی نے آج سات بجے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔"

میرے مُنہ سے اِس جملے کا نکلنا تھا کہ وسیع ہال میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ تمام افسر مع ہمارے وضع دار کرنل صاحب کے کرسیوں سے اُٹھے۔ جو کچھ ہاتھ میں آیا چھُریاں، کانٹے، پلیٹیں، نپکن، چھت کی طرف اُچھال دیا اور خود ناچنے لگے۔۔۔ انگریز بھی عجیب جانور ہے سنجیدگی کے موقع پر کم بخت برف بن جاتا ہے۔ کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے؟ لیکن تفریح کا مقام ہو تو اِس سے کوئی بے اعتدالی، کوئی بد

---

47 مسولینی کا بیڑا غرق ہو گیا ہے!

پرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید نہیں۔ کچھ دیر بعد ہنگامہ فرو ہوا تو بیَروں نے چھُریاں کانٹے چُن چُن کر دوبارہ آراستہ کیے۔ کھانا ختم ہوا تو شراب کے دَور شروع ہوئے جو رات بھر جاری رہے۔۔۔۔ انگریزوں نے تو خیر دُشمن کو شکست دی تھی، ہم نے کیا پایا تھا؟ غیر ارادی طور پر اس خوشی میں بھی غیر جانبدار ہی رہے۔ موقع پا کر باہر گئے اور خیمے میں جا کر سو گئے۔

اگلی صبح برزینی سے ملاقات ہوئی۔ خیال تھا بے چارے شکست خوردہ برزینی کو ہمدردی پیش کریں گے، لیکن برزینی خوشی سے چہک رہا تھا۔ حیرت ہوئی اور وجہ انبساط پوچھی تو بولا:

"جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اب جلدی اپنی سویٹ ہارٹ سے مِلوں گا۔"

اور یہ کہہ کر میری میز پر ایک مُسکراتی اطالوی لڑکی کی تصویر رکھ دی اور ساتھ ہی کسی قدر دعوے کے ساتھ کہنے لگا: "یہ میرا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ دعویٰ دراصل برزینی کی اپنی تسلّی کے لیے تھا اور حقیقت میں انگریزوں کا گزشتہ رات کا طرب بھی اِتنا قومی نہ تھا جتنا ذاتی۔ ہر انگریز کو یہی خیال تھا کہ وُہ جو پیچھے انگلستان میں بیٹھی ہے، واقعی انتظار کر رہی ہے یا کسی دُوسرے نے اس انتظار کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انگریزوں کو امریکی سپاہیوں سے خصوصی خدشہ تھا جو اِن دِنوں انگلستان میں

دخل در معقولات دے رہے تھے۔ جنگ میں زخمیوں اور مُردوں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے، لیکن ان دِلوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو طویل جدائیوں اور ازلی مثلث کے کرشموں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں۔

شکستِ قیمتِ دِل کی صدا کیا؟

مُجھے اس کرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایک عرصہ کے لیے مجھے اپنی یونٹ کے گورے سپاہیوں کی ڈاک سنسر کرنے کی ڈیوٹی دی گئی۔ ہر چٹھی ایک آہ تھی۔ ہر سطر ایک فریاد۔

"میری محبوبہ مُجھے بھُلانہ دینا۔"

"میری جان میرا اِنتظار کرنا۔"

"میری دِلرُبا امریکیوں سے بچ کر رہنا۔"

مسولینی کی شکست میں ہر انگریز کو وُہ لمحہ قریب نظر آیا جس سے پیشتر کہ اُس کی محبت پر کوئی غیر ڈاکہ ڈال دیتا۔ بس اِتنی سی بات پر یہ اظہارِ طرب تھا۔ لیکن دِل کی دُنیا میں یہی تو بڑی بات ہے۔۔۔ انگریزوں کا یہ خوف بجا بھی

تھا۔ ایک تو برطانوی اخباروں میں انگریز لڑکیوں اور امریکی سپاہیوں کی باہمی موانست کے قصّے بلکہ تصاویر چھپتی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر انگریز فوجیوں کے دِل چھلنی ہوتے تھے۔ دُوسرے خود قاہرہ میں اِن امریکیوں نے (جو ابھی ابھی نازل ہوئے تھے۔) اپنے ڈالروں اور چیونگ گم کے طفیل تمام مِصری معشوقاؤں کو انگریزوں سے چھین لیا تھا۔ وہی لڑکیاں جو قاہرہ کی رقص گاہوں اور ریستورانوں میں انگریز افسروں کی ہم نشینی پر کبھی ناز کرتی تھیں، اب جگالی کرتے ہوئے امریکی سار جنٹوں بلکہ سپاہیوں کی بغل میں جوابی جگالی کرتے ہوئے چلتیں اور پاس سے گُزرتے ہوئے انگریز افسروں کو رحم اور حقارت کے مِلے جلے جذبات سے دیکھتیں۔ بلکہ کئی شوخ طبع لڑکیاں انگریزوں کے جوشِ رقابت کو بھڑکانے کے لیے اپنے سینوں پر پیتل کے بنے ہوئے حروف U.S.[48] لگا لیتیں۔ یہ حروف امریکی فوجی اپنے کالر پر لگایا کرتے ہیں۔ انگریزوں سے اور کچھ بَن نہ پڑا تو اِن لڑکیوں کو UNSERVICEABKE یعنی ناقابلِ اِستعمال کہنے لگے کہ برطانیہ کی فوجی لُغّت میں U.S اِسی لفظ کا مخفّف ہے اور "کنڈم" مال کے لیے استعمال

48 United States کا مخفّف

ہوتا ہے۔ لیکن یہ دِل کو جھوٹی تسلّی دینے کی بات تھی۔ حاشاوہ بُتان مِصر کسی زاویے سے بھی ناقابلِ استعمال نہ تھیں۔ پھر جس بلندی پر اُنہوں نے یو۔ ایس کا بِلّا لگار کھا تھا، انگریزی پھبتی کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہ تھی۔

انگریزوں اور امریکیوں کی چشمک نے بے شمار لطیفے پیدا کیے۔ انگریز امریکیوں کو جنگی نقطہ نظر سے اناڑی سمجھتے تھے اور اُن کے لیے اکثر YELLOW یعنی بُزدل کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امریکی اِس پر ہنس دیتے اور اپنی چھاتیوں پر تمغوں کی طرف اِشارہ کرتے لیکن تمغوں کی عنایت کے مُعاملے میں خداوندانِ امریکہ بہت فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ایک امریکی سپاہی اگر دو سال نوکری کر لے تو اُس کی چھاتی پر قوسِ قزح اُتر آتی ہے۔ چنانچہ انہیں دنوں جب قاہرہ میں جنرل منٹگمری کی فتح لیبیا کے متعلق فلم دکھائی جائے گی تو انگریزوں نے ازراہ تفنّن مشہور کر دیا کہ امریکی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو امریکی سپاہی فلم DESERT VICTORY[49] دیکھ لے گا اُسے تمغہ دیا جائے گا لہٰذا سینما ٹکٹ کا کونٹر فائل ضائع نہ کیا جائے۔ امریکیوں نے اس مذاق کا جواب بعد میں سولونر کے مقام پر دیا جہاں جرمن گولوں کی بارش میں

49 یعنی صحرائی فتح۔ یہ جنرل منٹگمری کی فتوحات کے متعلّق انگریزی فِلم تھی۔

اُتر کر زورِ بازو سے جرمنوں کو میلوں دھکیل کر پیچھے لے گئے۔

اس کے بعد قیامِ قاہرہ کے دو ہی قابلِ ذکر واقعات ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں لیفٹیننٹ ورما کا اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہمارا اپنا عازمِ وطن ہونا۔۔ ورما کی ہر حرکت میں ہنگامہ ہوتا تھا، لیکن کہنے لگا کہ میری روانگی پرائیویٹ ہو گی۔ تمہارے بغیر کوئی الوداع کہنے نہیں آئے گا۔ میں اپنی جیپ میں اُسے قاہرہ اسٹیشن کو لے چلا تو راہ میں کہنے لگا: "ذرا فیفی (FIFI) کو بھی ساتھ لے چلیں۔ مَیں نے اُس سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

فیفی ورما کی چہیتی دوست تھی؛ چنانچہ فیفی کو بھی ساتھ بٹھالیا لیکن اسٹیشن پر پہنچے تو دیکھا کہ تین اور فیفیاں علیٰحدہ علیٰحدہ کھڑی ہیں۔ ورما کو عِلم نہ تھا کہ اُس کی باقی معشوقائیں بھی اُسے الوداع کہنے آئیں گی۔ اُدھر ہر ایک یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ وُہی ورما کی واحد دوست ہے، جو خُداحافظ کہنے کو پہنچی ہے۔ چنانچہ جونہی اُنہوں نے ورما کو دیکھا، مختلف سِمتوں سے اُس کی طرف بڑھیں۔ وُہ جو سب سے پہلے پہنچی، ورما سے لپٹ گئی اور تڑاخ سے ورما کے رُخسار پر ایک بآواز بوسہ داغ دیا۔ اصلی فیفی سے یہ دیکھا یا سُنا نہ جاسکا تو اُس نے بوسہ گیر فیفی کے ایک تھپڑ لگا دیا اور اُس سے گُتھم گُتھا ہو گئی۔ ورما اُنہیں علیٰحدہ کرنے لگا تو ایک تیسری فیفی آگے بڑھی اور ورما کو اپنی طرف کھینچ کر بولی کہ "جانے دو اِن جھگڑالو بلّیوں کو، اب مجھے الوداع کہنے دو۔" لیکن بیچاری الوداعی رسوم کی ابتدا بھی

نہ کر پائی تھی کہ آخری اور چوتھی فیفی نے حقِ شفعہ کے طور پر ورما کو پیٹی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ غریب ورما میدانِ جنگ سے تو سالم واپس آ گیا تھا لیکن میدانِ محبّت میں اُس کے پُرزے اُڑنے لگے۔ دیکھنے والوں کو رحم آیا تو مُنہ زور فیفیوں کو یکے بعد دیگرے لگام دی اور ورما کو بمشکل ریل کے ڈبّے تک پہنچایا۔

ورما ڈبّے میں بیٹھا ہی تھا کہ اُس فیفی نے جو سب سے پہلے سنبھلی، اپنی انگوٹھی اُتار کر ورما کے منہ پر دے ماری۔ یہی حرکت دوسری اور پھر تیسری فیفی نے کی اور پلیٹ فارم سے باہر چل دیں۔ ورما ان نبرد پیشہ معشوقوں کو قطار میں جاتے دیکھ کر غالب کی ہم نوائی میں کہہ سکتا تھا:

کسی کے گھر جائے کا سیلابِ بلا میرے بعد

مگر وُہ جو اصلی فیفی تھی اُس کی محبّت اُس کے جذبۂ رقابت پر غالب آئی۔ لپک کر ڈبّے میں پہنچی۔ اگرچہ خود بھی خستہ تن تھی لیکن بڑھی اور رنجور مسافر کے سر کو اپنی آغوش میں لے کر اُس پر گھنی پلکوں کا سایہ کر دیا۔ غریب ورما نے قدرے آسودگی محسوس کی اور آنکھ کھولی۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

لیکن ایک بات واضح تھی کہ غریب الوطنی میں اتنے وسیع پیمانے پر عاشقی کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی سویز کو روانہ ہونے لگی توفیقی نے ڈبّے سے اُتر کر ایک تَر رومال ہلانا شروع کیا۔ ہم نے یہ منظر دیکھا تو ہمیں اپنے دوست کی جدائی کے علاوہ بے کسیٔ عشق پر بھی بے اِختیار رونا آیا۔

کوئی مہینہ بھر بعد اسی ٹرین سے ہم عازمِ وطن ہوئے۔ خُدا جانے یہ افسوس کا مقام ہے یا فخر کا کہ ہم نے کسی فسٹ ایڈ کے اِستعمال کے بغیر قاہرہ کو الوداع کہا۔

مراجعت بہ وطن

۲۳ دسمبر ۱۹۴۳ء کو جب ہمارا جہاز ایسکینٹس (ASCANTUS) سویز کی بندر گاہ سے بحیرہ قُلزم کو روانہ ہوا تو ہم اس کے سینکڑوں انگریز مسافروں میں تقریباً واحد دیسی تھے لیکن جس خوشی سے یہ واحد دِل مچل رہا تھا وہ اِن سینکڑوں انگریزی دِلوں کو میسّر نہ تھی۔ وجہ صاف تھی کہ ہم جنگ سے وطن کو لوٹ رہے تھے اور انگریز وطن سے جنگ کو جا رہے تھے یعنی برما کے محاذ پر۔ اس روز ہمارے لیے پُورے اڑھائی برس کے بعد وطن کی دید کا خیال کس قدر نشاط انگیز تھا! اِتفاق سے اس سمندری سفر میں ہماری تفریح کے سامان ہماری توقّع بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ نکلے۔ لیکن مراجعتِ وطن کی مسرّت اِن عارضی خوشیوں سے بالا اور برتری رہی۔

ہمارے ہم سفروں میں خاصی تعداد خاکی پوش انگریز لڑکیوں کی بھی تھی جو ہندوستان اور برما میں مختلف جنگی خدمات کے لیے جا رہی تھیں۔ یعنی کچھ نرسیں، کچھ ڈاکٹر، کچھ سیکرٹری وغیرہ۔ اگرچہ اِن میں سے کئی ایک خاکی وردی میں بھی خورشید وماہ لگتی تھیں، لیکن وُہ جن کے دم سے یہ دوروزہ سمندری سفر ایک گلگشت میں بدل گیا یہ باوردی اجرام فلکی نہ تھیں بلکہ انسا(ENSA)[۵۰] کے باکمال ایکٹر اور باجمال ایکٹرسیں جو اِسی جہاز میں برما کے محاذ پر اپنے برٹش ٹامیوں کو تفریح بہم پہنچانے جا رہی تھیں۔ جنگی خدمت کے سلسلے میں یہ برطانوی تھیٹر کی پیش کش تھی۔

مسلسل جنگ اور مورچہ گیری سے سپاہی ایک روحانی فاقے کا شکار ہو جاتا ہے جو دُشمن کی گولی سے بھی مہلک تر ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بیچارے کو جس دِل پہ ناز ہوتا ہے، وُہ دِل نہیں رہتا۔ یہ انسا کمپنیوں کے تماشے اِسی بے دِلی کا درماں تھے۔ جنگ میں سپاہی کے لیے عورت کی دید سے بڑھ کر کوئی دوائے دِل نہیں اور انسا کی ایکٹرسیں اِس نکتے سے آشنا تھیں یا آشنا کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب کبھی دیدارِ عام کا اہتمام کرتی تو کچھ چھُپا کر نہ رکھتیں۔ اُن دِنوں ٹاپ لیس سوٹ کا رواج نہ تھا تاہم کسی سپاہی نے انسا کی

---

۵۰ انٹرٹینمنٹس نیشنل سروس ایسوسی ایشن۔

ایکٹرسوں سے یہ شکایت نہ کی کہ

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھّا ہے

یہی رعائتیں اِس سمندری سفر میں بھی روا تھیں بلکہ کرسمس کے موسم کی وجہ سے روا تر کر دی گئی تھیں۔ اِس موسم میں انگریز پاسبانِ عقل کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ دھکا دے کر اُسے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ چنانچہ پورے سفر میں صبح سے شام تک تفریحات کا سلسلہ تھا کہ ختم نہ ہونے پاتا تھا۔ جرمن آبدوزوں کا خطرہ تھا لیکن اس کا احساس سوائے سنتری کے کسی کو نہ تھا اور سَچ تو یہ ہے کہ جرمن آبدوزوں کے کپتانوں کو اگر ہمارے جہاز کے حالاتِ دروں کا علم ہوتا تو تارپیڈو بھیجنے کی بجائے خود کھنچے آتے۔ بہرحال سارے سفر میں دُشمن کی آبدوز کے متعلق صرف ایک ہی الارم ہوا اور الارم ہوتے ہی اہلِ جہاز نے پینے، ناچنے اور گانے کی رفتار اور تیز کر دی تا آنکہ ''آل کلیر'' کا سِگنل ملا اور سکون کے وقفے کا اعلان ہوا۔

سفر کی ایک رات یعنی ۳۱ دسمبر کی رات بھُولنے کی نہیں۔ سالِ نو کے خیر مقدم کی تقریب تھی۔ اُس شب عقل کے ساتھ شرم کو بھی غرقِ دریا کر دیا گیا اور دِلوں کو جملہ رسوم و قیود سے سپیشل چھٹّی ملی۔ نیم شب کی ساعت آئی تو اہلِ جہاز کے جنون کا سِلسلہ اِس قدر دراز ہو چُکا تھا کہ دامن کے چاک اور گریبان کا چاک کا فاصلہ ناپید تھا۔ اس بے

حجابی میں خواتین نے دوسرا نمبر لینا گوارا نہ کیا۔

مَست کب بندِ قبا باندھتے ہیں!

۴ جنوری ۱۹۴۴ء کی صبح کو ہمارا جہاز آہستہ آہستہ بمبئی کی گودی میں داخل ہوا۔ میں ایک مختصر سی نیند سے جاگا تو پورٹ ہول سے خشکی نظر آئی۔ ایک بے تابی کے عالم میں کپڑے پہنے، عرشے پر پہنچا۔ ارضِ ہند پر نگاہ پڑی تو آنکھوں میں وفودِ مسرّت سے آنسو چھلک اُٹھے اور جب بالآخر خاک وطن[۵۱] پر پاؤں رکھا تو خُدا جانے کتنی دیر احساس رہا کہ پاؤں کی بجائے جبین کیوں نہ رکھ دی۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی کیمپ تھا جہاں اڑھائی سال پہلے ہماری دُعا کو کسی بابو مزاج فرشتے نے محض ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے خُدا تعالیٰ تک جانے سے روک دیا تھا اور ہمارا سمندر پار کا سفر نہ ٹل سکا تھا۔ بہر حال اب خوش تھے کہ نہ صرف جنگ سے بچ کر آ گئے تھے بلکہ کسی قدر سچّا لہو لگا کر انگریزی غازی بھی بن چُکے تھے اور طبیعت میں ایک قِسم کی خان بہادری محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ کیمپ کے دفتر میں داخل ہوئے تو اندر اس بے تکلّفی سے قدم رکھا گویا صاحبِ خانہ ہمیں ہیں اور

---

۵۱ اس وقت تک پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

انگریز کمانڈانٹ نے بھی ہمیں خوش آمدید کہا تو اِس تپاک سے گویا ملک معظّم نے ذاتی طور پر ہماری خاطر ہدایات بھیجی ہوں۔ مُلاقات کے دوران ہمیں کمانڈنٹ صاحب نے سِگنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ میں تقرّر کا حکم نامہ دیا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ایک ماہ کی رخصت کا مژدہ بھی سُنایا اور اسی شب فرنٹیئر میل سے ہماری نشست کا انتظام بھی کر دیا۔

دُوسرے روز لاہور پہنچے۔ ہماری منزل تو آگے چکوال تھی جہاں سے اُتر کر اپنے گاؤں بَل کسر[۵۲] جانا تھا۔ لیکن گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رُکی اور ہم نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہمیں وہی کالج کے دِنوں کے مانوس در و دیوار نظر آئے۔ وہی رَس بھری پنجابی آوازیں کانوں میں پڑیں اور وہی بھاگ بھری قمیصیں اور شلواریں دکھائی دیں۔ ایک غیبی طاقت نے ہمیں لاہور اُترنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیشن سے نِکل کر چلے تو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ لاہور کے کوچوں میں چلنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے لاہور ٹھہرے۔ ٹھہرے کیا، اپنے آپ کو لاہور کے سپُرد کر دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے ہوائے

---

۵۲ بَل کسر ایک دلکش سا قصبہ ہے جو چکوال سے بارہ میل مغرب میں واقع ہے اور اپنے تیل کے چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک تیل کے چشمے بَل کسر کی وجہ سے مشہور ہیں۔

لاہور ہماری سہ سالہ اجنبیت کو دھو کر ہماری باضابطہ تطہیر کر رہی ہے۔

دُوسرے روز گھر پہنچے تو چھوٹوں کو بڑا پایا اور بڑوں کو اور بڑا۔ لیکن گاؤں کی بڑی خبر یہ نہ تھی کہ ہم نے انہیں کیسا پایا بلکہ یہ کہ ہم خود کیسے پائے گئے۔ خبر مشہور ہو گئی کہ کپتان آ گیا ہے۔

محمد خان آ گیا ہے۔ کتنا دُبلا پتلا تھا اب دیکھو کیا جوان نِکلا ہے۔ صاحب بن گیا ہے۔ سِرگٹ بھی پیتا ہے۔ مسکوٹ میں کھانا کھاتا ہے۔ نوکری پہرہ بھی معاف ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے چلتے کام چھوڑ کر مُلاقات کے لئے آنے لگے۔ ہم نے پہلے دو دن میں کوئی ایک ہزار معانقے کیے ہوں گے اور بس اتنی ہی ہمارے گاؤں کی مردانہ آبادی تھی۔ چھاتی دُکھنے لگی، لیکن دِل کو ایک عجیب سا سکون حاصل ہوا۔ مہینے بھر میں صرف چند روز اپنے گھر سے کھانا کھایا اور وُہ بھی والدہ کے اصرار پر کہ مُجھے اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لینے دو اور جب بہت دیر دیکھ چکیں، تو وہی کچھ کیا جو صرف ماں ہی کہہ سکتی ہے:
"بیٹا اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہو نا؟"

میں والدہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اگر اِس پیکرِ محبّت کا وجود نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن کی واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا۔ بغیر کسی جھجک کے جواب دیا: "جی ماں! ایک آدھ چھوڑ کر سب میرے ماتحت ہیں۔" اور ماں کی دنیا آباد ہو گئی۔ ویسے سَچ یہ تھا کہ ایک آدھ نہیں، بلکہ

ایک لاکھ چھوڑ کر بھی ہمیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لیے چراغ بلکہ سرچ لائٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن وُہ سچ کس کام کا جس سے ماں کا دِل دُکھے ؟

سیالکوٹ میں ایک سال

مہینے کی چھُٹّی پل بھر میں گزر گئی۔ سیالکوٹ کی تیاری کی۔ معادی کے سِگنل سکول میں ہم نے جس کیپٹن اُوڑاسنگھ کی جانشینی کی تھی وُہ اِن دونوں سِگنل ٹریننگ سینٹر سیالکوٹ میں متعین تھے۔ انہیں تار دیا کہ پہلے روز آپ کے یہاں ٹھہروں گا اور روانہ ہوا۔

اُوڑاسنگھ قیامِ قاہرہ کے دِنوں میں اپنی بیوی کی بدصورتی کے قصّے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مقابلہ حُسن کرانے والے کبھی بدشکل خواتین کا بھی مقابلہ کرا ڈالیں تو مسز اوڑاسنگھ کے ملکہ منتخب ہونے کا نہایت قوی اِمکان ہے اور پھر اپنی بیوی کے حق میں ایک غائبانہ آنکھ مار کر شرارتاً یہ مصرع الاپتے:

جتھّے لچھّی پیر رکھ دی، اوتھے اُگ دا سرو دا بوٹا[۵۳]

---

۵۳ جہاں لچھّی پاؤں رکھتی ہے، وہاں سرو کا پودا اُگتا ہے۔

مَیں یہ سمجھ کر مُسکرا دیتا کہ شاید یہ سردار جی کی دِل لگی کا انداز ہے ورنہ سردارنی بالکل بے قصُور ہو گی۔

لیکن سیالکوٹ پہنچا اور بھابھی جان کو دیکھا تو کیپٹن اوڑا سنگھ کی حق گوئی کے علاوہ اُن کی مظلومیت اور نفس کشی پر بھی یقین آ گیا۔ ظاہر تھا کہ محترمہ کج رُخانِ جہان میں بہت اُونچا مقام رکھتی ہیں۔ ذاتی کشش کا یہ عالم تھا کہ اگر موصوفہ رُخِ روشن کے سامنے شمع کی بجائے بھینس کھڑی کر کے پروانے کو دعوتِ اِنتخاب دیں تو پروانہ بے تحاشہ بھینس سے چمٹ جاتا۔ ویسے کیپٹن صاحب کو ایک اطمینان تھا کہ اگر کسی وجہ سے انہیں محترمہ کو شہر یا بَن میں تنہا بھی چھوڑنا پڑا تو اُن کی عصمت کا بال بیکا نہ ہو گا۔ کپتان صاحب دوست پرور آدمی تھے۔ ہر نئے دوست کو گھر لے جانے سے پہلے آنے والے صدمے سے آگاہ کر دیتے تھے کہ اچانک تعارف سے غریب کا دِل فیل نہ ہو جائے۔ میں تو ایک سال سے اِس حادثے کی تیاری کیے بیٹھا تھا لہٰذا میرا دِل فی الحال متحرک تھا۔

بعد میں جب مسز اوڑا سنگھ سے مزید واقفیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ کپتان صاحب اتنے بدنصیب نہ تھے جتنے ہم سمجھتے تھے۔ مسز اُوڑا سنگھ نے تقسیمِ حُسن کے وقت بیشک شدید غفلت برتی تھی لیکن عقل بٹتے وقت اِس خاتُون نے مستعدی کے علاوہ کسی قدر سکھا شاہی سے بھی کام لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دنیوی معاملات میں افلاطون کو بھی دو چار کام کی

باتیں بتا سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ماجھے کی صحّت مند جٹّی تھی۔ عقل اور صحّت کی اِس نادر آمیزش نے ایک اور قسم کا حُسن پیدا کر دیا تھا جو حُسنِ صورت سے کہیں زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعد میں مِسز اُوڑا سنگھ کے احترام میں اُن کی شکل کبھی حائل نہ ہوئی۔

دُوسرے روز دفتر گئے۔ کمانڈانٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بولے:

"اچھا ہوا تُم وقت پر آ گئے۔ کیپٹن ریز (RAINER) آج ہی رُخصت ہو رہا ہے۔ اس سے چارج لے لو۔"

مَیں سمجھا کوئی کمپنی ملے گی اور مزے سے کمان کریں گے، مگر ریز کے پاس پہنچا تو کوئی گز بھر لمبے اور اتنے ہی چوڑے رجسٹر، بہی کھاتے، رسیدیں اور کچھ نقدی اٹھا لایا اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا:

WITH LOVE TO THE NEW ACCOUNTS OFFICER[54]

مجھے معلوم تھا کہ فوج میں لڑنے کے علاوہ بیسیوں قسم کے دُوسرے پاپڑ بھی بیلنے پڑتے

---

54 نئے اکاؤنٹس افسر کی خدمت میں محبّت کے ساتھ۔

ہیں لیکن ایک لاغر سی اُمید تھی کہ ابھی اِن حساباتی پاپڑوں سے ذرا محفوظ رہوں گا، لیکن اب جب کہ بیلنا ہاتھ میں تھا اور پاپڑ سامنے رکھے تھے، کوئی مفر نہ تھا۔ چُپکے سے چارج پر دستخط کر دیئے اور سِگنل ٹریننگ سنٹر کے اکاؤنٹس افسر بن گئے۔

رجسٹر کے اندر جھانکا تو معلوم ہوا کہ اکاؤنٹس افسری تو سراسر علمِ دریاؤ ہے۔ مثلاً یہ کہ اِس میں کوئی جادو ہے جس کا نام ڈبل انٹری ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سنڈری کریڈیٹر کہلاتے ہیں اور کبھی سنڈری ڈیٹر بن جاتے ہیں۔ حیران ہو کر سوچا کہ الٰہی یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں اور یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔ لیکن قِصّہ مختصر اکاؤنٹنگ کے جملہ اسرارِ نہاں ہم پر آخر تک آشکار نہ ہو سکے۔ ہفتہ بھر کی بے نتیجہ جمع تفریق کے بعد اپنے دِل سے کہا کہ میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟ بھی کھاتے اُٹھا کر سیدھا خداوندِ سنٹر کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ اکاؤنٹس افسری اِس خاکسار کے بس کا کھیل نہیں۔

خداوند نے مُسکرا کر فرمایا "بغیر بس کے ہی کھیلو۔"

اور ہمارا کندھا تھپکا کر رجسٹر ہمارے حوالے کیے۔ واپس دفتر میں آیا اور اپنے یونٹ اکاؤنٹنٹ جگدیش لال سے پوچھا:

"میاں بغیر بس کے اکاؤنٹس کیسے کھیلے جاتے ہیں؟"

مُسکرایااور بولا: جیسے آپ سے پہلے ریز صاحب کھیلتے تھے۔"

اِس کے بعد جگدیش رجسٹر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد مکمّل کرلایااور بولا "جہاں ضرب کا نشان ہے ذرا دستخط کر دیں۔" دستخط ہو گئے تو کہنے لگا: "آج کا کام ختم سمجھیں۔"

خدا کا شکر ہے جگدیش لال ایماندار آدمی تھا، جس کے سہارے ہم نے سال بھر نمایاں کامیابی کے ساتھ اکاؤنٹس افسری کی۔ پھر اچانک ایک نئے کپتان صاحب سنٹر میں تشریف لے آئے اور ہم نے اپنے پیش رو کی تقلید کرتے ہوئے تمام تر رجسٹر اور بہی کھاتے مع اپنی بے پایاں محبّت اور خلوص کے اُن کے سپُرد کر دیئے اور کلمۂ شکر پڑھا۔ ویسے اگر آپ سنٹر کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو ہماری اکاؤنٹس افسرانہ خدمات کا ذکر سنہری الفاظ میں رقم ہو گا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سیالکوٹ کی زندگی میں محاذِ جنگ کی تکالیف نہ تھیں لیکن جنگ کے تکلّفات تمام تر موجود تھے۔ مثلاً بغیر وردی کے گھر سے باہر نہ نِکل سکتے تھے۔ کلب جاؤ تو وردی میں اور

بازار جاؤ تو وردی میں۔ سفید شریفانہ کپڑے پہن کر باہر نکلنے کو دِل ترس گیا تھا۔ چنانچہ کئی مرتبہ رات کو گھر کی تنہائی میں سوٹ پہنا، آئینے میں دیکھا، دو حسرت کی آہیں بھریں۔ سُوٹ اتار کر صندوق میں بند کر دیا اور مُنہ بسور کر پھر خاکی وردی پہن لی۔ گویا اپنی کپتانی کا اشتہار زیبِ تَن کر لیا۔

زندگی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی خوشیاں صرف گمنامی میں ہی میسّر آ سکتی ہیں۔ مثلاً چوک میں کھڑے ہو کر سلاجیت بیچنے والے کا لیکچر سُننا اور علی الاعلان نسخہ بنوانا، بندریا کا ناچ دیکھنا اور کھِلکھِلا کر ہنسنا، اُستاد گام کی دُکان سے سرِ بازار کباب کھانا اور اپنی آسودگی کی تصدیق ایک برہنہ ڈکار سے کرنا، سکینڈل پوائنٹ پر کھڑے ہو کر ڈنکے کی چوٹ دِل کی دھڑکن سُنانا اور گالی کھا کر بے مزانہ ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوچۂ دلدار کے چکر کاٹنا اور شکل و صورت سے یوں دکھائی دینا جیسے خدمتِ خلق کے لیے مارے مارے پھر رہے ہوں۔۔۔ لیکن فوجی یونیفارم پہنی ہو جو کلف سے کڑکڑا رہی ہو اور کپتان کا آبگینہ شانوں پر اُٹھا رکھّا ہو تو پہلا کباب کھاتے ہی، پہلی دھڑکن دھڑکتے ہی اور پہلا چکر کاٹتے ہی یہ آبگینہ چُور سمجھیں اور اگر کورٹ مارشل کی نوبت آ گئی، جو ضرور آنی چاہیے، تو پھر کپتانی کافور سمجھیں۔ چنانچہ ہم فقط ان خوشیوں کی ہی تمنّا کر سکتے تھے جن تک باوردی رسائی ممکن تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی خوشی یا ناخوشی از خود غریب خانے پر آ دستک دے۔

اور کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ ایک دن ہمارے بنگلے کے صحن میں ایک تانگہ آ کر رُکا۔ تانگے میں سامنے کی نشست پر کوچوان کے علاوہ ایک خاصی معمر خاتُون سوار تھیں۔ تانگے سے اُترے بغیر مُجھ سے مخاطب ہوئیں:

"تم ہو نا کپتان؟"

عرض کیا: "جی ہاں، ارشاد؟"

اور حیران تھا کہ خُدا جانے آج کس بلا نے خانۂ انوری کو انتخاب کیا ہے۔ بڑی بی نے جواب میں بے تامّل پتھّر دے مارا:

"تو شرم نہیں آتی؟ اِس بچّی کا دِل توڑ دیا۔"

یہ کہہ کر محترمہ نے ایک دِلسوزی آہ بھری اور پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ بچّی بیٹھی تھی۔ میں نے اِس بچّی کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا لیکن اب دیکھا تو ایسی بھی بھی نہ تھی۔ کوئی اٹھارہ سال کا سِن۔ شکل کی شریف، مگر آنکھوں کی شریر۔ وہی کانونٹ سکول کی آزادی اور خود اعتمادی کی مہر لگی ہوئی۔ خیر کوئی بھی ہو، ظاہر تھا کہ غلط فہمی کا مُعاملہ ہے لیکن اُدھر بی اماں کی نگاہ غضب میرے جسم و جان کے ساتھ دِل وجود کو بھی چیر کر پار ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے بچّی صاحبہ کی خدمت میں خاموش اپیل

کی کہ آپ کی امّاں حضور کا مغالطہ دور کر دیں، لیکن چھوٹی محترمہ نے جواب میں غیر جانبداری سے مُسکرا دیا اور تماشہ دیکھنے لگیں۔ بڑی بی نے برسنا جاری رکھا۔

”دو دن سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب آتا ہے، اب آتا ہے۔ یہ ہوتے ہیں لچھن ہونے والے دامادوں کے؟ کہاں ہے تمہاری امّی؟“

تو یہ بات تھی، ہم نے بی امّاں سے آنکھ بچا کر بچّی کو صاف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پُر زور غیر تحریری احتجاج کیا۔ جواب میں چھوٹی بی نے فقط انگریزی میں شانے سکیڑے اور آسمان کو تکنے لگی۔ گویا کہتی ہو۔ ”یہ معرفت کا معاملہ ہے مجھ سے مَت پُوچھ۔ اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی۔“ ہم نے ایک لمحے کے لیے مَن میں ڈوبنا شروع کیا تو چھوٹی بی نے ہماری سادگی پر ایک ہلکا پھلکا قہقہہ لگا دیا۔ یوں جیسے غلطی سے طبلے پر تھاپ پڑ جائے۔ اِس پر بڑی بی چونک پڑیں اور بولیں:

”اری چھوکری تو ہنس رہی ہے۔ ابھی تو رو رہی تھی۔“

”نانی جان یہ کیپٹن ظفر نہیں ہیں، کوئی اور ہیں۔“ بچّی نے ہنسی کو آدھا روکتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہائے میں نے کتنی غلطی کی۔“

بچّی بولی: ”کوئی بات نہیں، نانی جان یہ بھی ہنس رہے ہیں۔“

مَیں ہنس تو نہیں رہا تھ ؛۔ البتّہ ہنسی روکنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

نانی جان بولیں۔ ”بیٹا معاف کرنا میری نظر کمزور ہے۔“

نانی جان کی نظر بے شک کمزور تھی لیکن آپ کی زبان ماشاء اللہ خاصی شہ زور تھی جسے آسانی سے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اب ہم بھی سراغ پا چکے تھے۔ لہٰذا معاف کرنا ہی پڑا۔ اور سُراغ یہ تھا کہ یہ خواتین ہمارے دوست ظفر کی منگیتر اور منگیتر کی نانی تھیں اور یہ ڈرامہ ظفر اور ہماری ہونے والی بھابھی کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ظفر کی برات میں شمولیت کی یہ شرط رکھی تھی کہ ہمیں بھابھی جان پیشگی دکھائی جائیں۔ سو ہمیں بھابھی جان تو دکھا دی گئیں لیکن اس انداز سے کہ ہمارا نانی جان سے بَلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بے چاری نانی جان کو اِس بات کا عِلم نہ تھا کہ اِس ڈرامے میں اُن کا کردار محض قربانی کی نانی کا ہے۔

ایک اور بَلا خانۂ انوری کی بجائے انوری کے راستے میں آ نمودار ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں سینئر افسر اکثر انگریز ہی ہوتے تھے۔ ہندوستانی زیادہ تر لفٹین تھے یا کپتان۔ کوئی بھُولا بھٹکا میجر بھی نظر آ جاتا تھا لیکن کالا لیفٹیننٹ کرنل کالے گلاب کی طرح تقریباً ناپید تھا۔ ایک روز دوپہر کی چھُٹی کے بعد سائیکل پر میس کو جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے ایک اور سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ پاس سے گُزرا تو لفٹین سا نظر آیا، جس کے کندھے پر

دو پھُول ہوتے ہیں۔ ابھی چند گز ہی آگے نِکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

"HEY,COME HERE"(ارے۔ ادھر آؤ)

مُڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اِس گُستاخ نِدا کے منادی ہم ہی ہیں۔ حیران کہ یہ صاحب خُود کیوں نہیں آجاتے۔ بہر حال ہم ہی بیس قدم پیچھے چل کر اُن تک گئے اور دیکھا کہ اُن کے کندھے کے دو پھولوں میں سے ایک تاج ہے۔ یعنی جناب لیفٹیننٹ نہیں لیفٹیننٹ کرنل ہیں۔ معاً ہمارا ہاتھ سلیوٹ میں اُٹھ گیا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہم مؤدبانہ کرنل صاحب کے سامنے اٹینشن ہو گئے۔

ارشاد ہوا: "جب ہم سامنے آرہے تھے تو سلیوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟"

کرنل صاحب نے ذرا غیر متوقع پتھّر مارا تھا۔ فوج میں سینئر افسر کو سلیوٹ نہ کرنا جرم ہے اور اُسے جونیئر سے باز پُرس کا حق ہے۔ لیکن تجربہ کار افسر اس حق کو عقلمندی سے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی جہاں ضبط کا تقاضا ہو سختی سے گریز کرتے ہیں، لیکن جہاں سے فروگزاشت اتفاقاً یا سہواً ہو جائے، نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ کرنل صاحب کوئی دُوسری قسم کے سینئر تھے۔ مَیں جواب دینے میں ذرا جھجکا تو آواز بلند کرتے ہوئے بولے:

”بولو، سلیوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟“

عرض کیا: ”میں آپ کا رینک نہیں پہچان سکا تھا۔“

کرنل صاحب رُعب اور فخر سے چُور ہو کر اپنے دائیں کندھے کے تاج کی طرف ترِچھی نگاہ کرتے ہوئے بولے:

”تمہیں تاج اور پھول میں فرق نظر نہیں آتا؟“

عرض کیا: ”آتا ہے مگر سائیکل تیزی سے جا رہے تھے، اس لیے پہچان نہ سکا۔“

ارشاد ہوا: ”اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم سوائے انگریز کے کسی اور کو سلیوٹ نہیں کرتے۔

”یہ کرنل صاحب کی زیادتی بھی تھی اور بے ربطی بھی۔ مُجھے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ لیفٹیننٹ کرنل سہی، مگر عالمِ بالا میں کچھ بدامنی ہے۔ بہر حال اَدب اور سکون سے عرض کیا۔

”جناب یہ مطلب تو نہیں نکل سکتا۔“

جب مَیں یہ کہہ رہا تھا تو پاس ہی سے ہمارے یونٹ کا ایک انگریز کپتان سائیکل پر سوار

گُزرا جس نے حسبِ عادت ہمیں آنکھ ماری جو یقیناً کرنل صاحب کو بھی لگی۔ لیکن اُس نے کرنل صاحب کو سلیوٹ وغیرہ نہ کیا۔ کرنل صاحب نے مُجھ سے مکالمہ جاری رکھا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

نام عرض کیا، لیکن کرنل صاحب نام سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ ڈرے، کانپے اور معافی مانگے۔ جب ایسا نہ ہوا تو آپ نے ذرا زیادہ خوفناک حربہ استعمال فرمایا اور بولے:

"اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ؟" شناختی کارڈ ہر وقت ہر افسر کے پاس ہوتا ہے۔ جیب سے نکال کر ادب سے پیش کیا لیکن کانپنے سے پرہیز کیا۔ آپ نے کارڈ دیکھا۔ پھر اپنی نوٹ بُک میں کچھ کوائف نقل کیے اور کارڈ واپس کرتے ہوئے بولے:

"تمہاری رپورٹ سب ایریا کمانڈر کو کی جائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

عرض کیا: "سَر، میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

فرمایا: "بولو"

"سر، جب آپ نے سائیکل رُکوا کر مُجھے بیس قدم پیچھے طلب فرمایا تھا تو میں نے آ کر آپ کو سلیوٹ کیا تھا، لیکن آپ نے اُس کا جواب نہ دیا۔ میرے سلیوٹ میں کوئی نقص تھا؟"

بولے: ”ہم نے جواب نہیں دیا تھا؟ ہمیں خیال نہیں رہا ہو گا۔“

عرض کیا: ”ایسا ہی ہو گا مگر ابھی ابھی ایک انگریز کپتان بغیر سلیوٹ کیے گزرا، لیکن آپ نے اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ گستاخی معاف کیا آپ صِرف کالے کپتانوں کو ہی پکڑتے ہیں؟“

کرنل صاحب کے چہرے پر واضح گھبراہٹ تھی لیکن زبان میں دَم تھا۔ بولے:

”یہ تمہارا بزنس نہیں۔“

مَیں نے کہا: ”سَر شاید آپ کو علم ہے یا نہیں، سب ایریا آرڈرز کی رُو سے سائیکل پر جاتے ہوئے سلیوٹ کرنا لازم بھی نہیں۔“

کرنل صاحب کو اِس سوال کا کچھ جواب نہیں آتا تھا۔ اِضطرار میں بولے:

”یہ ہمارا بزنس ہے۔“

عرض کیا: ”مجھے بھی اِس واقعہ کی رپورٹ اپنے کمان افسر کو کرنا ہو گی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کیا میں بھی آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟“

اب اگر کوئی پختہ قسم کا جاندار سا کرنل ہوتا تو پہلے تو سلیوٹ پر جھگڑنے کی طِفلانہ

حرکت ہی نہ کرتا اور اگر کر بیٹھتا تو پھر ایک پکڑے ہوئے کپتان کی یہ جرأت نہ ہوتی کہ اُلٹا شناختی کارڈ مانگتا۔ لیکن ہمارے دیسی بھائی بظاہر نومولود سے لیفٹیننٹ کرنل تھے اور غالباً اسی خاکسار پر پہلی مرتبہ کرنیلی آزمارہے تھے۔ یوں تو کیا ہی اچھّا ہوتا کہ کرنل صاحب ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے مُسکرا کر ہاتھ ہلاتے اور ہم اپنے ہم وطن کے اوج طالع اور نگاہ التفات پر فخر کرتے ہوئے جوابی ہاتھ ہلاتے لیکن اب کرنل صاحب گرفت میں تھے تو یہ کمبل کا قصور نہ تھا، خود آپ نے اسے ذرا لپیٹا تھا۔ کسی قدر جھنجھلا کر بولے:

"اگر تمہارا کارڈ دیکھنا ضروری ہے تو یہ رہا کارڈ"

کارڈ دیکھا تو لکھّا تھا "لیفٹیننٹ کرنل ڈی سُوزا۔ یونٹ: ملٹری ہسپتال۔" گویا آپ ڈاکٹر تھے۔ اب لازم نہ تھا کہ آپ کا نام پتہ یاد رکھنے کے لیے ہم بھی نوٹ بُک کا سہارا لیتے لیکن ڈاکٹر صاحب کی ضیافتِ طبع کے لیے ہم نے کسی قدر اہتمام کے ساتھ جیب سے نوٹ بُک نِکالی، پھر ذرا خوش خطی سے کرنل صاحب کے کوائف لکھے اور آخر کار سلیقے سے کارڈ تہہ کر کے آپ کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کیا:

"مجھے جانے کی اجازت ہے؟"

کرنل صاحب نے جانے کی اجازت تو دے دی لیکن اُن کے دِل سے بے آواز پُکار اُٹھ

رہی تھی کہ خُدا کے لیے مَت جاؤ۔ ہم سے گھر میں ہی صلح کر لو۔

میس میں پہنچا تو کھانے کی میز پر اِس حادثہ کا ذکر کیا۔ سامعین زیادہ تر لیفٹینٹ اور کپتان ہی تھے۔ گویا جونئیر افسروں کی برادری تھی۔ ہمارے کارنامے پر خاصا فخر کیا گیا اور باقاعدہ فتح منائی گئی۔

پچھلے پہر اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ کیپٹن چکرورتی آ نِکلا اور بولا "چلو تمہیں چائے پلائیں۔ ہم فوراً ساتھ ہو لیے کیونکہ چکرورتی کی ٹی پارٹی ہمیشہ پُر لُطف ہوتی تھی۔ اس کے نصف مہمان صنفِ نازک سے ہونے کے علاوہ سچ مُچ نازک بھی ہوتے تھے جن کی ہم نشینی چائے کو خوشگوار ذائقہ بخشتی تھی۔

پُوچھا: "آج کس کو بُلایا ہے؟"

بولے "یہ سَرپرائز ہی رہے گی۔"

تھوڑی دُور گئے تو چِکی بجائے ریستوران کے ایک بنگلے میں داخل ہو گیا اور اندر جا کر بے تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں صاحبِ خانہ تشریف لائے۔ جی ہاں، وہی لیفٹینٹ کرنل ڈی سوزا ہی تھے۔ چِکی نے باہم تعارف کرایا:

"میرا دِلی دوست محمد خاں۔ میرے کرم فرما کرنل ڈی سوزا۔"

ابتدائی مزاج پُرسیوں کے بعد چائے آگئی اور اِس تکلّف کے ساتھ کہ ریستوران بھُول گیا۔ کرنل صاحب کا اندازِ تواضع: چائے پلائی تو شکر گھول دی۔ باتیں کیں تو اَمرت گھولنے لگے۔ آخر اُٹھے تو کرنل صاحب نے آئندہ مُلاقات کے وعدے پر اصرار کیا۔ قِصّہ مختصر باہر نکلے تو معلوم ہوا جیسے دِل کا ایک ٹکڑا کرنل صاحب کے گھر چھوڑ چلے ہیں۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ اِس منصوبے کا خالق چکرورتی تھا جس کی کرنل صاحب سے پرانی دوستی تھی۔ رہا وُہ سلیوٹ کا مُعاملہ تو خُدا جانے وُہ کن دو آدمیوں کے درمیان ہوا تھا۔ سوائے اِس کے کہ جب دو چار ملاقاتیں اور ہو چکیں تو کرنل صاحب اور ہم نے اپنی نوٹ بُکوں میں سے ایک ایک صفحہ بطور تعویذ ایک دُوسرے کو پیش کر دیا۔

سیالکوٹ کی زندگی میں قاہرہ کا سا تنوّع نہ تھا لیکن اس کی محدود دلچسپیاں تمام تر ہماری زَد میں تھیں:

۔۔۔۔۔۔ وہ با کھلے کلب کی مخلوط پارٹیاں اور مشکوک مُلاقاتیں، وُہ برج اور فلاش کی مشتبہ نشستیں جن میں سیالکوٹ کے کارخانہ دار اور اُن کی بیویاں مقامی افسروں اور اُن کی بیگمات کے آگے ہر شب سیکڑوں روپے ہار جاتی اور قدرتِ الٰہی سے یہی ہار دُوسرے روز ہزاروں کی جیت میں بدل جاتی۔

۔۔۔۔۔۔ وُہ سِگنل میس کی رجمنٹل نائٹ کی تقریبات جو رسمی ڈِنر کے آہنی قواعد اور

شاہی ٹوسٹ کی مُقدّس رسوم سے گزر کر بھنگڑے اور لُڈّی پر جا ختم ہو تیں اور آخری منازل میں ڈھولک کرنل صاحب کے گلے میں ہوتی اور الغوزہ ایڈ جوڈنٹ صاحب کے مُنہ میں۔

۔۔۔۔۔ وُہ مغربی رقص کی خاص راتیں کہ سفید جوڑے شب بھر پیتے اور تھرکتے تھرکتے اور پیتے۔ لیکن دیسی افسر دیوار سے لگ کر وال پیپر بنے رہتے کہ اکثر تو ناچنا ہی نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے اُن کی التجائے رقص بد دماغ میمیں دردِ سر کے بہانے ٹال دیتیں۔ حالانکہ اگلے ہی لمحے میں کسی انگریز کے بازوؤں میں ناچتے ہوئے مجسّم اسپرو بن جاتیں۔ اس ہتک پر ہم تمام لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں قومی پیمانے پر اپنی غلامی کا رونا روتے کہ گوری میموں تک رسائی نہ تھی اور کالی بیگمات ابھی رقص کے میدان میں اُتری نہ تھیں۔ زمین سخت تھی، آسماں دُور تھا۔

۔۔۔۔۔ وُہ مِلٹری ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر مِس جیننگ، جس کے سٹاف سرجن لگنے کے بعد چھاؤنی کے نصف سے زیادہ افسروں کو دردِ دِل کے دورے پڑنے لگے اور ہائے دِل پُکارتے پُکارتے اس کے پاس جا پہنچے لیکن مرض شناس خاتُون نے اُن کے دِلوں کو ٹٹولے بغیر سوڈا بائی کارب کی پُڑیا تھما دی اور واپس کر دیا۔ اور وُہ اِس خاکسار سے تمام افسروں کی رقابت کہ جہاں مِس جیننگ کو

دُوسرے مریضانِ دل کی پرواہ نہ تھی ہمارے لیے اُس کا دِل مہر و وفا کا باب تھا۔ اگرچہ اِس کی وجہ بالکل صاف ستھری، غیر پوشیدہ اور پڑتال کے لیے کھُلی تھی اور وہ یہ کہ ولایت سے ہندوستان آتے وقت جہاز میں مِس جیننگ ہماری ہم سفری نہ تھی بلکہ اُردُو میں ہونہار بروے کی طرح ہماری چکنی چکنی شاگرد بھی تھی۔ سو قدرتی امر تھا کہ اگر اُستاد کے دُشمنوں کی طبیعت کو کچھ ہو جاتا۔۔۔ اور اکثر کچھ ہو جاتا تھا۔۔ تو سعادت مند شاگرد سٹیتھوسکوپ اٹھائے خدمتِ استاد کو حاضر ہو جاتی۔ بس اِتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

لیکن سیالکوٹ کی زندگی میں حقیقی مسرّت اگر کہیں تھی تو وُہ مِس جیننگ کے التفات یا ڈاکٹر ڈی سوزا کی عنایات میں نہ تھی اور نہ ہی مخلوط کلبوں یا مشکوک پارٹیوں میں بلکہ لیفٹینٹ کیلاش ناتھ تلواڑ اور اُن کی خوش اطوار بیوی کے دولت کدے پر۔ خدا جانے ان دونوں نے مِل کر دلنوازی کے سلیقے پر کہاں سے چھاپہ مارا تھا کہ کیلاش کی صحبت میں بیٹھو تو قلب تسخیر کر لیتا تھا اور بھابھی ساوتری سے کلام کرو تو جادو ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں لوگ یا تو پیدائشی مہمان ہوتے ہیں یا پیدائشی میزبان۔ یہ میاں بیوی پیدائشی میزبان تھے۔ بخدا ہم پیدائشی مہمان تو نہ تھے، فقط یہ کہ تنہا افسروں کو اپنے شادی شدہ دوستوں سے تواضع کی کچھ توقّع ہوتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بھری چھاؤنی میں اِس

ساری تواضع کی ذمہ داری اس واحد جوڑے نے لے رکھی تھی۔ اگر بقول ابو بن اَدہم خدا واقعی ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو اُس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں تو خُدا کی فہرست میں ۱۹۴۴ء کے بعد ابو بن آدہم سے اوپر بھی دو نام ہوں گے۔

قیامِ سیالکوٹ کے آخری دِنوں میں ایک کرنل صاحب جی ایچ کیو دہلی سے تشریف لائے اور مُجھے حاضری کا حکم ہوا۔ حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ فوج کے کہ تعلیم کے اعلیٰ افسر ہیں اور چونکہ ہمارے سرکاری اعمال نامے میں تعلیم کے خانے میں میٹریکولیشن کے علاوہ کچھ اور بھی لِکھا ہے لہٰذا وُہ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہم سِگنل کور کو چھوڑ کر ایجوکیشن کور میں آنا چاہیں گے۔ سبز باغ کی سیر کراتے کراتے جناب کرنل صاحب نے باغ کے ایک کونے میں ہمیں میجری کی جھلک بھی دکھلائی۔ دِل ہی تو تھا، کمبخت شوقِ میجری سے بھر آیا۔ لیکن ہر چند کہ میجری کی کشش بے پناہ تھی، تاہم سنگل کور سے ترکِ وفا کا تصوّر بھی بے حد جاں گداز تھا۔ چنانچہ ہم نے اقرار تو کر لیا لیکن کچھ ایسا مبہم اور معمّہ نما سا کہ وقت آنے پر یہ معنی بھی نِکل سکیں اور وُہ بھی اور شارحین کا کسی ایک مطلب پر اِتفاق نہ ہو سکے۔ چنانچہ کرنل صاحب ہمارا یہ وعدہ لے کر رُخصت ہو گئے۔۔۔ دس دن بعد ہمارا تبادلہ اچانک ایسٹرن کمانڈ میں ہو گیا اور فروری ۱۹۴۵ء میں ہم عازمِ کلکتہ ہوئے، گویا ہمارا کرنل صاحب سے کیا ہوا وعدہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

ویکائی سِگنل سکول کی کمان

کلکتہ پہنچ کر چیف سِگنل افسر بر گیڈ ئیر ہرسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بر گیڈ ئیر صاحب نے خیریتِ مزاج کے بعد ہم سے گُزشتہ تجربے کے متعلق سوالات پُوچھے۔ جواب میں ہم نے اپنے اعمال نامے کے چیدہ چیدہ گوشوں سے پردہ سِرکایا۔ اعمال نامے میں ایک جگہ رقم تھا کہ اس شخص نے قاہرہ میں مردوں کے علاوہ چند یہودی لڑکیوں کو بھی سِگنل کی تربیت دی ہے۔ اس انکشاف پر بر گیڈ ئیر صاحب پھڑک اُٹھے۔ مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور کسی کو مخاطب کیے بغیر بولے:

"JUST THE MAN"[55]

خدا جانے آپ کب سے اِس خاکسار ایسے یگانہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اسی خوشی

---

55 بالکل وہی جس کی ضرورت تھی

میں آپ نے فون اٹھایا اور رانچی سے کسی کرنل جونز کو فون پر طلب کیا۔ کرنل جونز لائن پر آئے تو برگیڈئیر صاحب بولے:

"ٹونی تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے یعنی تمہاری لڑکیوں کا۔"

"لڑکیوں کا مسئلہ ؟" مَیں نے دِل میں کہا: "یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اِس خاکسار اور کرنل جونز کی لڑکیوں میں کیا ربط ہے ؟ پھر مسئلہ بھی ایک لڑکی کا نہیں لڑکیوں کا ہے۔ ہم مُسلمان ہیں اور شرح نے کڑی حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔"

دونوں انگریزوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ میں صرف برگیڈئیر صاحب کی باتیں سُن سکتا تھا۔

"ہاں ہاں، صحیح آدمی مِل گیا ہے، یہ بیٹھا ہے کیپٹن خان۔"

"تجربہ ؟ ارے میاں، سینکڑوں یہودی لڑکیوں کو ہینڈل کر چُکا ہے تمہاری لڑکیاں اُن سے زیادہ مُنہ زور نہیں ہو سکتیں۔ ہاہاہا۔"

ایسا کرتے ہوئے برگیڈئیر صاحب نے میری طرف اس توقع سے دیکھا کہ میں بھی ہاہا میں اُن کا ساتھ دوں لیکن مَیں صرف خفیف سی ہی ہی کر سکا۔ میں نے کبھی سینکڑوں یہودنوں کو "ہینڈل" نہیں کیا تھا۔ فقط دس لڑکیاں تھیں اور انہیں بھی ایک فاصلے پر

کھڑے ہو کر سبق دیا تھا۔ ہینڈل کرنا اور بھی ناواجب طور پر دُور کی بات تھی۔ برگیڈیئر صاحب بظاہر اُن لوگوں میں سے تھے جو یکلخت مزے میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اب آپ کرنل جونز کو ہمارے کوائف نہیں بتا رہے تھے، ہمارے متعلق شاعری کر رہے تھے۔

"ہاں ہاں بالکل آسانی سے، نوجوان آدمی ہے۔ کتنی چھوکریاں ہیں تمہاری؟"

"تین سو ساٹھ؟ پانچ اور کیوں نہیں رکھ لیتے۔ کیلنڈر مکمل ہو جائے گا!!!"

"خدایا تین سو ساٹھ لڑکیاں۔" ہم نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ "ہمارا کیا استعمال ہونے والا ہے؟"

برگیڈیئر صاحب بدستور سخن طراز تھے:

"شادی؟ ہاں ہاں شادی شدہ ہے۔" (اور بجائے اِس کے کہ ہم سے تصدیق کرالیں۔ ہمیں آنکھ مار کر خاموش کر دیا، لیکن شادی نہ شادی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاہا"

(ہمیں دُوسری آنکھ ماری)

بالکل بے ارادہ طور پر ہمارے ہونٹ بھی کھل گئے، جسے برگیڈیئر صاحب نے اپنی داد سمجھا۔ بولے:

”ٹونی۔ تم خان سے مل کر بہت خوش ہو گئے۔ بڑا نائس فیلو ہے۔“

ہماری ستائش ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جھک کر آداب عرض کروں یا بیٹھے بیٹھے دند کیڑ[۵۶] طاری کر لوں۔۔۔۔ گفتگو جاری تھی:

”آج ہی شام کی گاڑی سے چل پڑے گا اور کل تمہارے پاس ہو گا۔“

ٹیلیفون بند ہوا تو برگیڈئیر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے اور بولے:

”یہ کرنل جونز تھے[۵۷] کے ایل آف سی سِگنل رانچی کے کمان افسر۔ جونز کی زیرِ کمانڈ جمشید پور میں ایک بہت بڑا ویکائی یعنی لڑکیوں کا ٹریننگ سکول ہے۔ وہی ٹاٹا کی جگہ، یہ سکول غریب جونز کے لیے دردِ سر بن گیا ہے۔ کوئی افسر وہاں مہینے سے زیادہ نہیں ٹھہر تا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تُم اپنے بے مثال تجربے کی

---

۵۶ دند کیڑ چکوال کی زبان میں زور سے دانت بھینچنے کو کہتے ہیں۔ ماڑو چکوال کا مشہور بھانڈ تھا۔ تماشہ شروع کرنے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کر کے بآواز بلند کہتا: ”ہندو رام، مسلمان کلمہ اور جولاہے دند کیڑ“۔ اِس کے بعد حاضرین سے جولاہے پہچاننا کُچھ مشکل نہ ہوتا کیونکہ چار و ناچار بیچارے دانت بھینچے بیٹھے ہوتے تھے۔

۵۷ ‘K’ L OF C SIGNALS

بنا پر۔۔۔۔"

افسروں کی بے ثباتی کے متعلق مجھے ٹیلیفون کی گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ باقی زبانی بتا دیا گیا۔ چنانچہ دُوسرے دن میں اپنے بے مثال تجربے سمیت رانچی پہنچ گیا۔ کرنل جونز سے مُلاقات ہوئی تو انہیں بھی بریگیڈئیر صاحب کی طرح خوش مزاج پایا لیکن ذرا زیادہ حقیقت پسند۔ بولے:

"خان۔ ویکائی سِگنل ٹریننگ سکول کی کمانڈیوں تو دِل کش ہے لیکن ذراTricky ہے، لیکن خیر تمہارے بے مثال تجربے۔۔۔۔"

اگلے روز جمشید پور پہنچا۔ سیدھا دفتر میں گیا۔ وہاں ایک اُدھیڑ عمر کی اینگلو انڈین خاتُون مسز پیٹر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے کپتانی لگائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ہماری نیابت کا کام کریں گی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ تین سو ساٹھ لڑکیوں میں سے ایک سو برٹش ہیں، ایک سو اینگلو انڈین، ایک سو ہندوستانی اور ساٹھ گورکھا۔ گویا اچھی خاصی زنانہ اقوامِ متحدہ تھی۔ بطور آفیسر کمانڈنگ سکول کے اندر ضبط، تربیت وغیرہ کی ذمہ داری ہماری تھی لیکن ہوسٹل کے معاملات کے لیے مسز پیٹر جواب دہ تھی۔ یہ معلوم ہوا تو ہمارا آدھا دردِ سر ہلکا ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ لڑکیوں کے نازک مسائل کی جائے پیدائش ہوسٹل ہی ہوتا ہے۔ کلاس میں ہوتا ہی کیا ہے؟ سبق؟ اگر کوئی لڑکی سبق بھول گئی تو

آفت نہیں آجائے گی۔ جی چاہا تو ذرا غصّہ ہو لیں گے ورنہ معاف کر دیں گے۔

ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک صُبح سارجنٹ رابسن آیا۔ سلیوٹ سے ظاہر تھا کہ کسی کی شکایت لے کر آیا ہے۔ بولا:

"گزشتہ رات کارپورل کلونت کور کو ایک خفیہ چٹھّی DECIPHER کرنے کو بھیجی گئی۔ مگر اُس نے اِنکار کر دیا اور کہلا بھیجا 'جو کچھ کرنا ہے کرلو، کیپٹن خان مُجھے اچھی طرح جانتے ہیں'۔"

کلونت کور نے ایک حد تک درست کہا تھا۔ صرف دو روز پہلے اُس کے والد جو جمشید پور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، مُجھے ملنے آئے تھے اور کلونت کور کو بھی ساتھ لائے تھے۔ کلونت کور ایک دراز قد، جواں سال اور دلاویز سِکھ لڑکی تھی۔ اس کے نیم وا رسیلے ہونٹ ہر لحظہ مسکراہٹ پر تُلے رہتے تھے۔ وُہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی لاڈلی تھی۔ لیکن اب فوجی ضبط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ کلونت کور کو دفتر میں طلب کیا۔

کلونت کور آئی تو ہمارے دفتر میں اس بے تکلفی سے داخل ہوئی جیسے چائے پر مدعو ہو اور ابھی اس نے ہمارے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہم اس کی خوشبو کے نِصف قطر میں آ گئے۔ اِن حالات میں بے لاگ افسری آسان کام تو نہ تھا لیکن ہم ثابت قدم رہے۔ کلونت کور نے رابسن کو کھڑے دیکھا تو ذرا ٹھٹکی اور اس پر ایک قہر آلودہ نِگاہ

ڈالی۔ پھر اپنی خودرَو مُسکراہٹ کا رُخ ہماری طرف موڑا، لیکن ہم اس وقت کرسی عدالت پر بیٹھے تھے۔ کسی جوابی مُسکراہٹ کے بغیر خالص فوجی انداز میں کہا:

"کارپورل کلونت کور سارجنٹ رابسن نے رپورٹ کی ہے کہ تم نے کل شام خفیہ چِٹھی کا صاف زبان میں ترجمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟"

کلونت کور جھٹ پنجاب میں بولی: "حرامی جھوٹ بکدا اے۔"

خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس غیر متوقع اور غیر فوری جواب پر ہم نے ہنسی کو کیسے دبایا اور فوجی ضبط کی بحالی کے لیے کس مشکل سے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی کے آثار پیدا کیے۔ سنبھلنے میں خاصی دیر لگ گئی لیکن آخر کہا:

"کارپورل کور۔ انگریزی میں بات کرو اور ٹھیک اٹن شن کھڑی ہو جاؤ اور میرے سوال کا جواب دو۔"

کلونت کور کو مجھ سے۔۔۔ یعنی ایک ہم وطن سے اور خصوصاً پرسوں کی ملاقات کے بعد ایسے ٹھیٹ سرکاری سلوک کی توقع نہ تھی۔ کلونت کور نے تو رابسن سے اِس اُمید پر ٹکر لی تھی کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟ لیکن اب "اُس" نے ہی لاج نہ رکھی تو پژمُردہ سی ہو کر رہ گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ مَیں نے سوال دہرایا۔

"پلیز بتاؤ کہ سارجنٹ کا حکم کیوں نہیں مانا؟"

کلونت کور بدستور خاموش تھی۔ اس کی نگاہیں زمین میں گڑی تھیں۔ عدالت نے سوال جاری رکھے:

"تو کیا اِس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں اپنے قصور کا اعتراف ہے؟"

میرا یہ کہنا تھا کہ کلونت کور کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے سارجنٹ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اُس کا دروازے سے نکلنا تھا کہ کلونت کور زار زار رونے لگی۔ اب عدالت کے سامنے یہ سوال نہ تھا کہ ملزمہ قصوروار ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ ملزمہ عدالت کا قصور معاف کر کے رونا بند کرے گی یا نہیں، لیکن آنسوؤں کی رفتار سے واضح تھا کہ محترمہ کا عدالت کی جاں بخشی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم نے کلونت کور کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں کرسیٔ عدالت خالی کر کے ملزمہ کو پیش کی اور اسے ضبط کی تلقین کرنے لگے۔

تلقین کے دوران ہمیں گزرا ہوا زمانہ یاد آیا جب ہم مَردوں کی کمانڈ کیا کرتے تھے۔ وُہ لوگ جب کسی قصور پر دھر لیے جاتے تھے تو تازہ وردی پہنے رائٹ لفٹ کرتے کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے۔ دو سوالوں کے بعد اکیس روز کی قید کا نام سُنتے تو پھُرتی سے سلیوٹ کرتے۔ رائٹ لفٹ کرتے کمرۂ عدالت سے باہر نکلتے اور تین ہفتے کوارٹر گارڈ

میں گزار کر ہنستے کھیلتے یونٹ کی زندگی میں اس طرح شامل ہو جاتے جیسے سینما دیکھ کر آئے ہوں۔ کہاں وُہ سپاہیوں کی کمانڈ اور کہاں ان ویکائیوں کی نازبرداری کہ

ہو کر اسِیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مِس کور کے لیے چائے کی پیالی منگوائی۔ اگرچہ حقیقی ضرورت عرق گاؤزبان مع خمیرہ مرواریدکی تھی۔ مِس کور نے دو گھونٹ چائے کے پیے۔ اس کی سِسکیوں میں ذرا افاقہ ہوا تو ہر دو جہاں سے عموماً اور ہم سے خصوصاً خفا ہو کر چل دی۔

اب ہم پر روشن ہونے لگا کہ ہمارے پیشرو صاحبان اس سکول میں ایک مہینہ سے زیادہ کیوں نہیں ٹھہر پاتے تھے اور یہ ابھی ابتدا تھی۔

لڑکیوں کی تعداد کے پیشِ نظر سکول میں شبینہ کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک شام ہم نے وائرلیس کی کلاس کا چکر لگایا جس میں پندرہ بیس اینگلو انڈین لڑکیاں زیرِ تربیت تھیں۔ دروازے پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے کتّے نے باریک مگر مصمم سی بھونک سے ہمارا راستہ روکا۔ ہم ابھی اُس پر واضع کر رہے تھے کہ برخوردار کتّے یونٹ میں ہی یونٹ کے کمان افسر پر نہیں بھونکتے کہ کمرے سے زنانہ سرگوشیوں بلکہ بھاگ دوڑ کی آواز آئی اور جب دروازے کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں اپنی آرائش کی چیزیں لِپ سٹک، پاؤڈر، نیل پالش، آئینے۔۔۔ تیزی سے اِدھر اُدھر چھپا رہی ہیں۔

آخر جب ہمارے احترام میں ناچار سیٹوں پر بیٹھ گئیں تو معلوم ہوا کہ ہماری ہونہار طالبات آرائش کے مختلف مراحل سے گُزر رہی ہیں۔ کسی کے بالوں میں کرلر لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ایک ہونٹ پر سرخی ہے لیکن دوسرا فی الحال ابلق ہے۔ کسی نے اپنے چہرے کے لیے کریم نکالی تھی لیکن ہمارے دخل در معقولات کی وجہ سے وائرلیس سیٹ کے عارض ہی ملیح کر دیے ہیں۔

تو یہ تھی ہماری وائرلیس کی کلاس! کوئی کہنہ سال اور پکے دِل کا کرنل ہوتا تو یہ افراتفری رکھ کر غصّے سے لاوا بن جاتا اور ساتھ ہی طالبات کو بھی بھسم کر دیتا۔ لیکن ہمارے پہلو میں ابھی ملائم اور جونئیر سا دِل تھا۔ چنانچہ ہمارا پہلا ردِّ عمل تو ایک بے پناہ قہقہہ تھا جسے ہم نے چھینکوں اور کھانسی کی شکل میں خارج کیا۔ پھر اپنی کمان افسری کا تمام تر رعب چہرے پر اکٹھا کر کے کلاس سے پُوچھا۔

"لڑکیو، تمہارا اُستاد سارجنٹ رابسن کہاں ہے؟"

یہ پُوچھ ہی رہا تھا کہ مقابل کے دروازے سے باہر برآمدے میں سارجنٹ رابسن دکھائی دیا۔ کمرے سے نکلنے کے لیے اچھا بہانہ تھا۔ باہر جا کر رابسن سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سارجنٹ رابسن نہایت سکون سے قِصّہ بیان کرنے لگا۔

"سَر، آج یہ لڑکیاں گورے سپاہیوں کے کیمپ میں ڈانس پر مدعو ہیں۔ کلاس ختم ہونے

کے بعد انہیں براہ راست وہاں جانا ہے۔ لہٰذا آرائش کا سامان لے کر یہاں آ گئی ہیں۔ کلاس میں آیا تو میں نے بھی وہی کچھ دیکھا جو آپ نے دیکھا۔ مُجھے بھی آپ کی طرح ہنسی اور غُصّہ مِل جل کر آئے، لیکن لڑکیوں نے مُجھے وُہ کہا جو آپ کو نہیں کہا۔ یعنی یہ کہ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو برآمدے میں کھڑے ہو کر چوکیداری کرو۔ دُوسری طرف مِس سونیا نے اپنا کتّا کھڑا کر دیا۔ شاید آپ کی اُس بدتمیز سے بھی مُڈ بھیڑ ہوئی ہو۔ مَیں ایک کلونت کور سے نہیں لڑ سکا تھا۔ بیس سونیاؤں سے کیا الجھتا؟ آپ کو رپورٹ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کہ کلونت کور کے بعد آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اِس لیے کہ اِس وقت آپ کے لیے بیس لڑکیوں کی اشک شوئی اور چائے نوشی کا انتظام ذرا مُشکل تھا۔"

گویا سارجنٹ رابسن کو کلونت کور کے قصّے کا آدھا نہیں پُورا علم تھا اور وُہ جانتا تھا کہ کیا گزری تھی قطرے پہ گُہر ہونے تک۔ ہم نے سوچا کہ اگر ان بیس اینگلو انڈین قطروں نے بھی گُہر ہونا شروع کر دیا تو ہماری کپتانی چائے دانی بن کر رہ جائے گی۔ چنانچہ ناچار اپنی راؤنڈ کے خاتمے کا اعلان کیا اور سامنے ہنستی کھیلتی سونیا کو دیکھ کر اپنی بے بسی کا اِقرار کر لیا۔

تری دُنیا میں مَیں مجبور و محکوم

مِری دُنیامیں تیری پادشاہی

دو دِن خیریت کے گزرے۔ تیسرے دِن مقامی فوجی ہسپتال سے ڈاکٹر کا فون آیا۔

"آپ ہی او۔ سی ویکائی سکول ہیں؟"

"جی ہوں۔"

"آپ کے سکول کی دو لڑکیوں نے آج صُبح SICK REPORT[58] کیا ہے۔"

"کیا ہو گا۔ خیریت تو ہے؟"

"یوں تو خیریت ہے۔ صِرف ان میں سے ایک کے بچّہ ہونے والا ہے۔ یہ مِس جولیا ہے۔"

خدا جانے میں یہ سُن کر کرسی سے اُڑ کر چھت کو کیوں نہ جا لگا۔ میں نے کہا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ بچّہ یعنی۔۔۔یعنی یہاں تو سب لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔"

---

58 اپنی بیماری کی ڈاکٹر کو خبر کرنا

"جی ہاں۔ جبھی تو آپ کو بتا رہا ہوں۔ ورنہ یہ خوش خبری براہ راست مُنّے کی ماں کو سُناتا۔ لڑکی سکول پہنچے تو مناسب ایکشن لیں۔"

"مناسب ایکشن ؟ وُہ کیا ہوتا ہے ؟"

اِضطرار میں بھاگ کر مسز پیٹر کے پاس پُہنچا اور کہا:

"مسز پیٹر غضب ہو گیا۔ مِس جولیا کے بچّہ ہونے والا ہے۔"

مسز پیٹر چھُوٹتے ہی بولی:

"تو پھر روکو اُسے" اور یہ کہہ کر مُسکرا دی۔

مسز پیٹر کی رگِ ظرافت محض میرا ذاتی اِضطرار دیکھ کر پھڑک اُٹھی تھی ورنہ بچّے کی آمد ہم دونوں کے لیے مساوی طور پر مُضر تھی اور کچھ یہ بھی کہ ہماری کمان میں یہ پہلا حادثہ تھا لیکن مسز پیٹر کی تو یہ کیفیت تھی کہ

ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے

رجسٹر میں کوائف دیکھے تو معلوم ہوا کہ جولیا کے والدین جمشید پور میں ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فون اٹھایا اور مسز پیٹر کو بتایا کہ میں جولیا کے باپ سے بات کرنے لگا

ہوں۔ مسز پیٹر بولیں: "اوں ہوں، باپ سے نہیں ماں سے۔" اور یہ کہہ کر فون میرے ہاتھ سے لے لیا۔ جولیا کی ماں سے دو پیاری پیاری باتیں کیں۔ کچھ دیر بعد وُہ تشریف لے آئیں۔ اور قِصّہ مختصر اُسی شام جولیا کو لے کر اُس کی خالہ کے ہاں کلکتہ چلی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے کچھ نہ سُنا۔ سکول کے رجسٹر میں جولیا کی غیر حاضری کے خانے میں لفظ بد ہضمی لکھا تھا۔

خُدا جانے ہم کیا کیا اُمنگیں لے کر کمان کرنے آئے تھے، لیکن ظاہر تھا کہ اُن امنگوں کے پھلنے پھُولنے کے لیے فضا ساز گار نہیں۔ دو چار دن کے بعد رانچی سے ہمارے کمپنی کمانڈر میجر شاہانی معائنے کے لیے تشریف لائے اور بمشکل میرے پاس بیٹھے ہی تھے کہ گورکھاوِنگ سے اِطّلاع آئی کہ مِس لتا گورنگ پچھلی رات سے غائب ہے۔ میجر شاہانی نے میری طرف اِستسفارانہ دیکھا تو میرے مُنہ سے نِکل گیا۔

"وہ ذرا کھٹمنڈو گئی ہو گی، آجائے گی۔"

میجر شاہانی یوں بھی سنکی سے تھے۔ چِڑ گئے اور بولے:

"تو مِس جولیا شاید لندن تک گئی ہوئی ہیں اور سُنا ہے کہ اُن کا پاؤں بھی ذرا بھاری تھا۔"

میجر صاحب معائنے سے پہلے بظاہر خاصی تفتیش کر کے آئے تھے۔ ہم نے ناچار جولیا کی

امیدواری کے سِلسلے میں اثبات میں سَر ہلایا۔ میجر صاحب کسی قدر خفگی سے بولے:

"بچّہ کیسے ہو گیا؟"

اب اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ مُجھ سے مشورہ تو کیا نہیں گیا تھا۔ عرض کیا:

"حسبِ معمول ہی ہوا ہو گا۔ لڑکی کے چلے جانے کے بعد میں نے تفصیل میں جانا مناسب نہ سمجھا۔"

"احتیاطی تدابیر کیوں نہ اِختیار کیں؟"

میجر صاحب اب بھولی باتیں کر رہے تھے۔ عرض کیا:

"ایک احتیاطی تدبیر تو خود سرکارِ برطانیہ نے کی ہے۔ یعنی لڑکیوں کے ہوسٹل کے سائے میں انگریز سپاہیوں کا رُخصتی کیمپ کھول دیا ہے۔"

میجر صاحب بولے: "سرکاری پالیسی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔"

عرض کیا: "تو پھر قدرت کی پالیسی پر بھی راضی رہنا چاہیے۔"

قِصّہ مختصر میجر شاہانی ناخوش ہوئے اور رانچی جا کر کرنل جونز سے ہماری شکایت کر دی۔ ہمیں رانچی طلب کیا گیا اور ہم بہ ہزار شوق و جملہ سامان چل پڑے کہ شاید اِس کمانِ

نسواں سے امان مِلے لیکن کرنل جونز نے قِصّہ سناتو بولے:

"تمہاراکام لڑکیوں کو سِگنل کی تربیت دینا ہے۔ سو وُہ اطمینان بخش ہے۔ ان کی اخلاقی نگرانی مِس پیٹر کا کام ہے اور جمشید پور کے حالات کے پیشِ نظر یہ بھی معقول ہے۔ باقی رہامیجر شاہانی تو وہ JITTERY (ڈرپوک) ہے۔"

یہ تو ٹھیک تھا لیکن میں خود بھی اِس زچّہ و بچّہ کی دیکھ بھال سے رُخصت ہونا چاہتا تھا۔ عرض کیا:

"کیا یہ ممکن نہیں کہ مُجھے رانچی میں ہی کوئی مردانہ کام دے دیا جائے؟"

بولے: "نہیں ایک سال تک ممکن نہیں۔"

بڑی مایوسی ہوئی۔ سوچا، کون جیتا ہے اِن ویکائیوں کی زُلف کے سَر ہونے تک۔ اگر سال بھر اِن کی نگرانی کرتے رہے تو ہم لیڈی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ جمشید پور سے بچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

دُوسرے دن ابھی رانچی میں ہی تھے کہ اچانک ہمیں دفتر میں طلب کیا گیا۔ جی۔ ایچ۔ کیو دہلی سے ہمارے متعلّق چِٹھّی آئی تھی کہ اگر یہ افسر ایجوکیشن کور میں تبادلے پر رضامند ہے تو فی الفور پچمری میں تعلیمی کورس کے لیے حاضر ہو جائے۔ ایجوکیشن

کرنل سے سیالکوٹ والی ملاقات یاد آ گئی۔ اُس وقت باوجود میجری کے سبز باغ کے ہمیں سِگنل کور چھوڑنا شاق نظر آتا تھا اور اب پھر سِگنل سے قطع تعلق کا خیال ہمارے لیے سوہانِ رُوح تھا لیکن جب ویکائیوں کے غول کے غول اپنے نامعقول آنسوؤں اور نامولود بچّوں کے ساتھ ہمارے تصوّر میں نمودار ہوئے تو ہم پچمری جانے کے لیے رضامند ہو گئے اور تیسرے دن وہاں پہنچ گئے۔

پچمری کا قیام مختصر تھا۔ دو ماہ کے کورس میں ہم پر فوجی تعلیم کے اسرار و رموز فاش کیے گئے اور کورس کے خاتمے پر ہمیں ایک مُستند ایجوکیشن افسر کے طور پر جی۔ ایچ۔ کیو دہلی کے حوالے کر دیا کہ جہاں جی چاہے اِستعمال کر کے دیکھ لو۔ جی۔ ایچ کیو نے ہماری آزمائش کے لیے برما انتخاب کیا اور ۲۱ جون ۱۹۴۵ء کو ہم کلکتہ سے پرواز کر کے مٹکیلا کے ہوائی اڈے پر اُترے۔

برما۔ بربادی و بحالی میں ہمارا حِصّہ

برما کی زرخیزی کے متعلق ایک مغربی مصنّف نے لکھا ہے کہ زمین کو گدگداؤ تو ہنس کر موتی بکھیر دیتی ہے[59]۔ جب ہم مٹکیلا کے ہوائی اڈے پر اُترے اور گردوپیش نگاہ ڈالی تو ظاہر تھا کہ اس سرزمین کو ایک مدّت سے ہنسنا نصیب نہیں ہوا۔۔ تین سال کی دردناک جنگ سے اس کی کھیتیاں ویران اور بستیاں سُنسان ہو گئی تھیں اور دردناک تر یہ کہ اہلِ برما کے دِل ویران ہو گئے تھے۔ اگر کسی لب پر خندہ تھا یا کسی آنکھ میں چمک تھی تو یہ برمی لب و چشم نہ تھے۔ کوئی امریکی، انگریزی یا ہندوستانی فوج کا فاتح سپاہی ہو گا۔ رہے جاپانی تو وُہ برما میں آخری مرتبہ مُسکرا چکے تھے اور اب جنگ ہار کر شبِ غم گزارنے کے

---

59 Tickle the Earth, it laughs in harvest

لیے سیام کو پسپا ہو رہے تھے۔

مضافاتِ مکٹیلا سے گُزرتے ہوئے جابجا کاسۂ سر نظر آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ چند روز پیشتر زندہ جاپانی دلیروں کے سرِ پُر غرور تھے لیکن اس وقت برما میں زندہ جاپانی صرف دو قسم کے تھے۔ وُہ جو اسیرانِ جنگ تھے یا وُہ جو اس حالتِ یاس میں بھی کسی کمین گاہ میں اپنے فاتحین کی خاطر اپنی آخری گولی محفوظ رکھے بیٹھے تھے۔

چنانچہ جس وقت ہم برما پہنچے، ہماری فوج کشت و خون سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی۔ ہمارا کام اب برباد برما اور برمیوں کو آباد کرنا تھا۔ گویا خاص تعمیری کام تھا اور یہ تعمیر ہم نے دِل و جان سے کی۔ اگرچہ گاہے گاہے وسائل برما کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مسائلِ نفس کی تسخیر میں بھی اُلجھ گئے۔ لیکن دِل ہی تو تھا۔ چنانچہ دُوسروں کے حُسنِ کارکردگی کے صدقے خطاکاروں کو بھی معاف کر دیا گیا۔ خود غالب نے بھی ان لوگوں کی معافی کی سفارش کی ہے:

دیا ہے دِل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے؟

اور اہلِ دِل کا ازل سے فتویٰ ہے کہ کچھ نہ کہیے چھوڑ دیجئے۔ چنانچہ چھوڑ دیے گئے۔ یہی خطا پوشی کی پالیسی تھی جس نے برما کے شکستہ و ریختہ نظام کو مہینوں میں چالو کر دیا اور ساتھ ساتھ ہمارا اپنا نظام بھی چالو رہا کہ مزدور خوش دل کند کار پیش۔

ہمارا تقرر ۵۰۵ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ہوا اور پہلی مرتبہ ہم سٹاف افسر یعنی جی تھری (G-۳) مقرر ہوئے۔ ہمیں جلدی معلوم ہو گیا کہ اس اسامی میں رہ کر ہمارا مقابلہ جاپانیوں سے بھی قوّی تر غنیم سے ہے۔ یعنی دفتری کرسی سے جو مسلسل بیٹھک سے ہمارا اجزوِ بدن بننے لگی تھی۔ ہم آج تک رجمنٹ کی کھُلی فضا میں رواں دواں زندگی گزارنے کے عادی تھے جہاں آبلہ پائی بھی ایک طرح کی رحمت تھی۔ اب آبلوں کی تو یہاں بھی کمی نہ تھی لیکن غلط جگہ پر تھے اور یہ ایک ایسی زحمت تھی جس سے مجنوں جیسا ستم رسیدہ بھی محفوظ رہا تھا۔ آخر تنگ آکر اپنے جی۔ ون (G-۱) لیفٹیننٹ کرنل اِنگل بی (INGLEBY) سے التجا کی کہ ہمیں کوئی برونِ در کا کام دیا جائے۔ کرنل صاحب ایک دلنواز سے بزرگ تھے۔ بولے: "شمالی برما کا دورہ کر لو کہ مختلف یونٹوں کے مسائل سے آشنا ہو جاؤ۔" اور ایک جیپ ہمارے حوالے کر دی۔

ہم نے مہینہ بھر میں مانڈلے، میمو، لاشیو، بھامو، مچنیا الغرض آدھا برما چھان مارا۔ برما نوردی کی کچھ یادیں باقی ہیں:

۔۔۔ وُہ پہاڑوں پر پگوڈوں کی قطاریں کہ جب تک برما یا پہاڑ ختم نہ ہوں، پگوڈے ختم نہیں ہوتے۔ برما کے پہاڑوں نے جہاں کہیں کہنی نکالی ہے یا سَر اُبھارا ہے مہاتما بدھ کے شیدائیوں نے اُسے پگوڈے کی ٹوپی پہنا دی ہے۔

۔۔۔ وُہ سڑک پر جابجا بُدھ کے سیرین (SERENE) اور سکون بخش مجسمے کہ ہم بُت شِکن بھی پاس سے گُزرتے تو شانتی محسوس کرتے۔

۔۔۔ وُہ مانڈلے میمو کی سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل کہ جس سے رینگ کر سانپ بھی سڑک پر آنکلتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم جیپ سواروں سے اپنی خراشوں کے لیے ڈیٹول مانگ رہا ہے

۔۔۔ وہ سیپا کے دیوداروں کے سلسلے گویا دیووں کے دیار میں آنکلے تھے۔

۔۔۔ وہ برما روڈ کے ناگہانی موڑ جن کی گولائیوں سے خبردار کرنے کے لیے امریکی انجنیئروں نے عام نشانوں کی بجائے بے لباس حسیناؤں کی تصویریں بنادی تھیں۔

۔۔۔ وُہ لاشیو میں ایک چینی رئیس کے ہاں دعوتِ چائے کہ جس کی لطافت نے تمام تر غبارِ خاطر دھو ڈالا اور وُہ کیف و سرور بخشا کہ قلعہ احمد نگر کے اسیروں کو بھی رشک آئے۔

۔۔۔ اور آخر میں ہمارے یونٹوں کے مسائل جن کی خاطر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ہم جہاں بھی گئے جوانوں کو شادیاں پایا اور کیسے نہ پاتے؟ راشن کی فراوانی، پیسوں کی بیکرانی اور سب سے بڑھ کر آٹھ پہر کی حکمرانی۔ تعمیرِ مُلک جو کر رہے تھے۔ چنانچہ

واپس آکر ہم نے سب "اچھا" کی رپورٹ دی تو ہمارے انگریز سینئر نے ہمیں شاباش دے کر ہماری ترقّی کی سفارش کر دی۔ گویا شمالی برما میں خیر و عافیت ہمارے دم قدم سے ہی تھی۔

اُدھر اچانک حکم شائع ہوا جس کی رُو سے ہمارا تبادلہ مٹکیلا سے مانڈلے کر دیا گیا۔ یوں سمجھیں جیسے جہلم سے راولپنڈی۔ مانڈلے کے متعلق اپنے گاؤں کے ایک جہاں گرد تاجر سے سُن رکھا تھا کہ دِلّی کی طرح ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔ اور یہ کہ رہتے ہیں منتخب ہی وہاں روز گار کے۔ لیکن جا کر دیکھا، خصوصاً اس کے قلعہ مُعلّٰی کو محسوس ہوا کہ انتخاب ضرور رہا ہو گا لیکن شاہ مندان کے زمانے میں ہیں۔ اب تو فلک کے علاوہ جاپانیوں اور انگریزوں نے اُسے اس تفصیل سے ویران کیا تھا کہ اِس اُجڑے دیار میں گھاس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اور اب اِس کے مکینوں یعنی ہم لوگوں کا مدار اِس گھاس کے کھودنے پر ہی تھا کیونکہ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ گھاس ٹائفس بردار جراثیم سے اَٹی پڑی تھی۔ چنانچہ پہلے چند ماہ ہمارا شغل گھاس کھودنا ہی رہا اور ظاہر ہے کہ اس رُوپ میں ہمیں کوئی بے کلیم مہاجر ہی روز گار سمجھ سکتا تھا۔ بہر حال جب چھ ماہ کی مسلسل کھدائی کے بعد مانڈلے کی صحت بحال ہو گئی اور ہمارے حُلیے میں منتخبانِ روز گار کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو یکا یک ہمارے ہیڈ کوارٹر کو مانڈلے سے میمو جانے کا حکم مِلا۔ مانڈلے سے میمو جانا بالکل ایسے ہی تھا جیسا راولپنڈی سے مَری جانا۔

مَری کی طرح میمو بھی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوش مزاج سا شہر چہ ہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی بٹالین رنگون سے میمو منتقل ہوئی تھی تُو اُن کے خُون کو گرمانے کے لیے ہماری فوج کے انگریزی روزنامے SEAC[60] نے اپنے مخصوص مغربی بے حیائی کے انداز میں یہ سُرخی جمائی تھی:

"مژدہ جوانو میمو کی چھ سو دوشیزائیں تمہارے لیے چشم براہ ہیں۔"

اِس بات کو دو مہینے ہو چکے تھے اور ہر چند کہ اب منتظر آنکھوں کی تعداد اور شوق میں خاصی کمی کا امکان تھا تاہم ایک موہوم سی توقع تھی کہ میمو کے در و بام سے کوئی بچی کھچی آنکھ ہمارے انتظار میں بھی وا ہو گی اور کسی نہ کسی دریچے سے ہمارے مقدم میں بھی کسی رُومال کو جنبش آئے گی لیکن میمو پہنچے تو کسی آنکھ کو یہ کہتے نہ سُنا کہ تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ۔ بیسیوں دریچے کھُلے پائے۔۔۔ لیکن کسی ایک میں بھی ساکن یا متحرک رُومال دکھائی نہ دیا جس کا رُوئے سخن ہماری طرف ہو۔ اور آخر جب ایک کھڑکی میں سَچ مُچ ایک رُومال

---

60 ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ

نظر آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کسی معصوم کا دُھلا ہوا نیپکن سُو کھ رہا ہے۔ گویا اس گھر میں بھی عشق و محبّت کی داستان بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ میمو میں زندگی کی رفتار زندہ رہنے کے لیے کافی نہیں۔

بات یہ تھی کہ برما کے باقی شہروں سے کچھ زیادہ میمو کا حُسن اور شباب جنگ کی نذر ہوا تھا۔ میمو کی خوشگوار ہوا نے جاپانی فوج کے تمام تر ہوس پرستوں کو کھینچ لیا تھا۔ چنانچہ اب حُسن میں رنگ تھا نہ شباب میں اُمنگ۔ اگر اس وقت غالب میمو آنکلتے تو دیکھتے کہ ابرو نے ہاتھ سے کمان رکھ دی ہے اور غمزے نے کمر سے خنجر کھول دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں نہ گناہ میں لذّت ہے نہ ثواب میں سُرور۔ یہاں دوکانداری سے لے کر عِشق بازی تک نقطۂ انجماد سے نیچے کے ماحول میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ پہلے دِن میمو میں داخل ہوئے تو ہمارے دِلوں پر اوس کے علاوہ کچھ اولے بھی پڑے اور ہم دن بھر سَر کو زانو پر دھر کر بیٹھے سوچتے رہے۔

لیکن ہمارا ہیڈ کوارٹر جس میں پچاس سے زیادہ افسر اور سینکڑوں متعلقین تھے بے فکرے اور زندہ دِل فاتحین کا ٹولہ تھا۔ انہوں نے اولے اُٹھا کر فلک کو دے مارے۔ اِدھر میمو کے حزن خانے میں بھی کئی سدا بہار قسم کے لوگ تھے جو عارضی طور پر خواب سرما میں مدہوش پڑے تھے۔ وُہ جاگے اور ہر دو عناصر کا اِتّصال ہوا تو میری

زندگی نے آنکھ کھولی۔ پہلے برف پگھلنا شروع ہوئی۔ پھر بہار نے کروٹ لی اور دِنوں میں سُنسان محلّے چہچہانے لگے۔ دفعتہً میمو نے تیغِ نگاہ کو آب دینا شروع کیا اور اس کے گلی کوچوں میں فِتنہ ساماں جیپیں تانے بننے لگیں۔ ہار کورٹ بٹلر جھیل کی مچلتی سطح پر حشر ماجرا کشتیاں کھیلنے لگیں۔ ریس کورس کا رنگارنگ ہجوم واضح طور پر جوڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے مرد کلرک غائب ہونے لگے۔ ان کی جگہ دھان پان بَرمی اور اینگلو برمی لڑکیاں لینے لگیں اور ہمارے کائی آلود دفاتر کشتِ زعفران میں تبدیل ہونے لگے۔ حوالدار کلرک بنتا سنگھ کی جگہ مِس پَرل کا آنا گویا ایک بنٹے کی جگہ گوہر کا آنا تھا۔ یہ گوہر کیپٹن گرین (GREEN) ویلیفئر افسر کے حِصّے میں آیا اور جن جذبات سے کیپٹن صاحب نے دوستوں میں مِس پرل کی آمد کا ذکر کیا وہ انگریزی الفاظ میں تھے لیکن فیض انہیں اُردو کا لباس بھی پہنا چکے ہیں۔ یعنی

جیسے ویرانے میں چُپکے سے بہار آجائے

کیپٹن گرین اِس اینگلو برمی حسینہ کے سحر میں ایسے کھوئے کہ کچھ عرصہ بعد خداوندانِ فوج کو اُنہیں حکماً جدا کرنا پڑا۔ کیونکہ کیپٹن صاحب کے سوا باقی تمام فوج کے ویلفیئر کا کام دھک سے رُک گیا تھا۔

ہماری اپنی کلرک ایک نرم و نازک خالص بَرمی لڑکی تھی، ماکن چی۔ جتنا پیارا نام تھا،

اتنی ہی نازک اندام تھی۔ ٹائپ کرنے کو ایک ڈرافٹ دیا تو ٹائپ کرنے کے علاوہ اصلاح بھی کر لائی۔ تعلیم پُوچھی تو معلوم ہوا انگریزی میں ایم۔ اے ہے۔ جی چاہا اپنی کرسی خالی کر دیں۔ لیکن ماکن چی بہت سُلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ بولی: "آپ کو کرسی مبارک۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔

یونیورسٹی کھُلنے والی ہے۔ مَیں جلد ہی اپنی کرسی پر چلی جاؤں گی۔ یعنی بطورِ لیکچرار۔ جنگ کے دنوں میں بیکاری کی بجائے نوکری کر لی کہ اس میں پیسوں سے زیادہ عافیت کا پہلو تھا۔"

ماکن چی کو بھی ہماری طرح ٹوجو[61] سے کوئی عناد نہ تھا۔ محض حالات کا ساتھ دے دی تھی۔

میمو کے ویرانے میں بہار آئی تو ہمارے لیے پھُولوں کی بجائے تاج لائی یعنی ہماری موعود پروموشن کا حکم آ گیا اور ہم میجر بن گئے۔ کندھوں پر میجری لگا کر دیکھی تو محسوس ہوا کہ وزن بڑھ گیا ہے۔ آپ کسی تازہ میجر سے پوچھیں۔ پروموشن کی آج کل بھی یہی تاثیر ہے اور ہمیں میجری کا نشہ کچھ اس لیے بھی گہرا محسوس ہوا کہ ہمارے تین ماتحت کپتانوں میں سے دو انگریز تھے۔ وہی انگریز جن کی مُلازمت کرتے کرتے ہم

---

61 زمانۂ جنگ میں جاپان کے مشہور وزیرِ اعظم

نے لاکھوں کے بول سہے تھے۔ یوں تو جنگ انگریز کی تھی۔ ہم دیسی اُن کے سینئر ہو کر لڑتے یا جونئیر ہو کر، بہر حال اُن کی خاطر ہی لڑ رہے تھے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ انگریز افسروں کو چاروں شانے ماتحت پایا اور اُنہیں سلیوٹ کرتے اور یس سر کہتے سُنا تو وطن کی غلامی کچھ غم کچھ ہلکا ہو گیا۔ جی تو چاہتا کہ ان سے کوئی ٹھوس سا قصور سرزَد ہو تو انہیں سزا دے کر تھوڑا سا جلیانوالہ کا بدلہ بھی لیا جائے لیکن انگریز کم بخت اتنا اچھّا حاکم نہیں جتنا اچھّا ماتحت ہے۔ ایسی بے عیبی سے بات کرتا ہے کہ انتقام لینے کی بجائے انعام دینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ انگریز ماتحتوں سے ہمارے تعلقات چار و ناچار دوستانہ ہی رہے۔

ہمارا تیسرا ماتحت ایک دیسی کپتان تھا لیکن اس قدر پیارا رفیق ثابت ہوا کہ ہمارے باہمی رشتے سے افسری ماتحتی خارج ہو گئی۔ یہ تھا رام لعل گُڈ ہوک [۶۲]۔ خوش طبع۔ وجیہہ۔ رونق آفریں اور شریر۔ مجھ سے پہلی مرتبہ برما ہی میں مِلا۔ ایک کپتان میں اتنے اوصاف کا جمگھٹا دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کی مٹّی ہے اور پُوچھا تو وہیں کا نکلا جہاں کا ہونا چاہیے تھا یعنی چکوال کا۔ یوں بھی خاک وطن کا مُجھ کو ہر ذرّہ دیوتا تھا۔ رام لعل ایک بالکل گرائیں دیوتا نِکل

---

۶۲ تقسیم مُلک کے بعد اِن سے رشتہ کٹ گیا۔ معلوم نہیں آج کل کیا اور کہاں ہیں۔

پڑا۔ میمو کی زندگی پہلے ہی پھُولوں سے عبارت تھی، رام لعل کی زندہ دِلی نے اسے مسلسل پھُلجھڑی بنادیا۔

کبھی کبھی یہ پھُلجھڑی پُوری آتشبازی کی شکل اِختیار کرلیتی۔ مثلاً جب کبھی تمام ہندوستانی افسر میس میں مل کر انگریزوں کو سُنانے اور ستانے کے لئے "برما کی لونڈیا" کا کورس گاتے تو کیپٹن [۶۳] محمد امین کی سربراہی میں وہ اُدھم مچاتے کہ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی ایمپائر کی بنیادیں ہلتی نظر آتیں اور وُہ چار و ناچار ہمارے کورس میں شامل ہو کر چلّانے لگتے:

"ملتی ہے چہرے پر مٹی تالاب کی"

جب کبھی میجر شنگھاڑا سنگھ [۶۴] پنجابی میں گوندھی ہوئی انگریزی میں حالاتِ حاضرہ پر لیکچر دیتے۔ اُن دنوں کیبنٹ مشن دِلی آیا ہوا تھا۔ اِس سلسلے کے ایک لیکچر میں آپ نے راجہ غضنفر علی خان اور لارڈ پیتھک لارنس کا ذکر کرنا تھا۔ اِن ناموں کے تلفّظ کے متعلق لیکچر سے پہلے اس خاکسار سے مشورہ کرنے آئے۔ آپ غضنفر کو غنضفّر بروزنِ تنفّر ادا کرتے تھے۔ مَیں نے اِسی تلفّظ کی پُر

---

۶۳ آج کل لیفٹیننٹ کرنل محمد امین آرمی سروس کور

۶۴ یہ نام ہم لوگوں کا دیا ہوا تھا۔ آپ کا اصلی نام کُچھ اور تھا۔

زور تائید کر دی اور کہا کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔ پیتھک لارنس وہ صحیح طور پر ادا کرتے تھے لیکن مَیں نے مشورہ دیا کہ آپ پیتھک[۶۵] لارنس کہیں تو گرامر کی رُو سے زیادہ فصیح ہو گا۔

سردار صاحب دام میں آ گئے۔ سینکڑوں دیسی اور انگریز افسروں کے سامنے نہایت خود اعتمادی سے غلط تلفّظ دُہرانے لگے۔ پہلی مرتبہ سامعین ذرا مُسکرائے لیکن سمجھے کہ شاید سردار صاحب کی زبان کی لغزش ہے مگر جب فاضل مقرّر نے غنفرّ علی خان اور پیتھک لارنس کی بوچھاڑ شروع کر دی تو پتہ چلا کہ سردار صاحب کی زبان نہیں، دماغ لغزش کر رہا ہے۔ پھر شنگھاڑا سِنگھ کا اندازِ خطابت! معلوم ہوتا تھا انگریزی میں بانی پڑھ رہے ہیں۔ سُننے والے ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگے۔ چند ایک نے ہمت کر کے سردار جی کے تلفّظ کی اصلاح کی کوشش کی لیکن شنگھاڑا سنگھ نے اپنے اصلاح کنندوں پر حقارت سے ہنستے ہوئے ہمیں آنکھ ماری اور اپنے معترضین کو ڈٹ کر کہا:

"پُترو پہلے گرامر پڑھ کر آؤ پھر غلطی نکالنا۔"

اور اپنا لیکچر جاری رکھا۔

---

۶۵ Pathetic بمعنی قابلِ رحم

لیکن میمیو اور مانڈلے کی گیتوں بھری کہانی میں گڈ ہوک۔ امین اور شنگھاڑا سنگھ کے علاوہ چند اور مشاہیر کا حِصّہ بھی تھا۔ مثلاً

○ لیفٹیننٹ ریاض[٦٦] احمد خان افسر کمانڈنگ سپلائی ڈپو مانڈلے جو بَرمی بادشاہوں کے بعد قلعہ مانڈلے کے پہلے شاہی قسم کے مکین تھے۔ آپ کے دربار میں اور دستر خوان پر صلائے عام تھی لیکن آپ کی نازک مزاج جیپ مسماۃ رانی (جو بَرما کی جیپوں میں فرسٹ لیڈی سمجھی جاتی تھی) آپ کے سِوا صرف ایک اور بارِ لطیف کی متحمل ہو سکتی تھی۔ وُہ بارِ لطیف بتدریج بیگم ریاض کی شکل اختیار کر گیا۔

○ لیفٹیننٹ عصمت[٦٧] اللہ چوہدری جن کی موجودگی میں کسی محفل، گاؤں یا قریے کا بے رونق رہنا ناممکن تھا۔ آپ کو بیوقوف ڈھونڈنے اور بیوقوف بنانے میں الہامی دسترس تھی۔ حتیٰ کہ آپ نے شوخ و شنگ گڈ ہوک کے دِل پر بھی چرکہ لگا کے چھوڑا۔ لیکن اِن چرکوں ہی سے تو برما کی محفلیں رنگین تھیں۔

---

٦٦ بعد میں میجر ریاض احمد خان اے سی ایس۔

٦٧ اب لیفٹیننٹ کرنل عصمت اللہ چوہدری اے ایس سی

○ میجر چندرا (وٹرنری کور) میرے شریف رُوم میٹ تھے مگر ایک اوباش کتّے مسمّی پیٹر کے مالک تھے۔ چندرا خود بہو بیٹی قسم کے آدمی تھے لیکن پیٹر کے معاشقے زبان زدِ میمو تھے۔ پیٹر صُبح و شام رفیقۂ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور دُوسرے کتّوں اور ان کے مالکوں کے امن میں مُخل ہوتا۔ لیکن جب ہمسایوں کے گِلوں سے تنگ آکر چندرا پیٹر کو سرزنش کرتا تو بے چارا خاموشی سے سر جھُکائے مالک کی تلخ ترش باتیں سُنتا رہتا۔ آخر جھاڑ ختم ہو چکتی تو آنکھ کھولنا اور صبر و رضا کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتا۔ گویا کہتا ہو:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دِگر

اور پھر اوّلین فرصت میں چندرا سے آنکھ بچا کر شہر میں عشق کرنے نکل جاتا۔

اور آخر میں قبلہ و کعبہ لیفٹینٹ کرنل سید حیدر علی گردیزی[۶۸] کی کمان افسر فیلڈ ایمبولینس کلا جو بَرما کمانڈ کے ہر ہندوستانی افسر کو تعارف سے پہلے ہی دِل میں جگہ دے دیتے تھے۔ یونٹ کے لوگ آپ کو کمان افسر سے زیادہ پیرو مرشد سمجھتے تھے۔ آپ اکثر ملتانی زبان میں کلام کرتے جو ہمیں انگریزی کی

---

۶۸ آج کل کموڈور (برگیڈیئر) سرجن جنرل پاکستان نیوی

طرح مُشکل لگتی اور کبھی انگریزی بولتے تو اس کی مُلتانی بنا دیتے اور اپنے انگریز سامعین کو مستقل طور پر ہراساں رکھتے۔ آپ کی ہر بات اور ہر حرکت میں تفریح کا پہلو تھا لیکن بھولے پن کا یہ عالم کہ ہنسی کی بجائے پیار آتا۔ دِل کے اتنے صاف جیسے معصوم بچّہ اور مزاج کے ایسے شیریں جیسے نادار دوشیزہ جو دیسی یا بدیسی افسر ایک مرتبہ آپ سے مِل لیتا آپ کا مدح سرا ہو جاتا۔ لیکن

کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوسِ بریں

ہمارا برما کا قیام ڈیڑھ سال کا تھا جو گویا ڈیڑھ لمحے میں گُزر گیا اور اچانک ہمارا تبادلہ فرنٹیئر کور میں پشاور ہو گیا۔ پارٹیوں کے ایک ناگزیر سِلسلے سے گراں شِکم مگر سرخرو نکلے اور آخر میمو کو الوداع کہی۔ میمو سے رنگون تک جیپ میں سفر کیا اور دیکھا کہ ہمارے قیام کے دوران برما کے بے شمار زخم بھر آئے ہیں۔ سرِ راہ برمی بچّوں کو دیکھا تو اُن کے گالوں میں انگارے تھے۔ جوان مٹیاروں کو دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں تارے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لہلہاتے دھانوں کے کھیت دھوپ میں یوں جھلملا رہے تھے جیسے بزازِ فطرت نے حدّ نگاہ تک سبز ساٹن کے تھان کھول رکھے ہوں۔ ہم نے دِل ہی دِل میں رُو بصحت برما سے کہا کہ شاید تُجھے احساس ہو یا نہیں مگر

ہمارے اشک تِری عاقبت سنوار چلے

بَرما سے پاکستان براہ مدراس

رنگون سے بحری جہاز میں سوار ہوئے اور ایک مختصر سے سفر کے بعد مدراس کے ساحل پر اُترے۔ بظاہر تو ایک غیر مُلک سے وطن کو لوٹے تھے لیکن وطن کا یہ حِصّہ برما سے کم اجنبی نہ تھا۔ بَرما کی زبان کا صَوتی حلیہ "چُوو۔ پو۔ اُوئی۔ تُولی۔ کھ۔ پھ۔" تھا اور تامل کا "گڑ گڑم۔ ینگم۔ ٹنگا۔ پٹنگا۔ اِلّے۔ پلِّے۔" گویا دونوں زبانیں ہماری اُردُو یا پنجابی آوازوں سے تقریباً دو ہزار کالے کوس دور تھیں لیکن غنیمت تھا کہ مدراس اور بنگلور کے ہفت روزہ قیام میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا یعنی ہوٹل کے بیرے وغیرہ، سب انگریزی بولتے تھے، اگرچہ عجیب غیر جانبدارانہ انداز میں۔ مثلاً ہوٹل سے باہر جانے لگے تو بیرا بولا:

"ماسٹر کس وقت آئے گا؟"

ہم نے کہا "کونسا ماسٹر؟"

بولا "ماسٹر" اور "ماس" پر ادب سے زور دیا۔

ہم سمجھے خُدا جانے کس بلا کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہم نے لاپرواہی سے کہہ دیا "ماسٹر واسٹر نہیں آئے گا۔"

سلام کر کے چلا گیا۔ جب واپس آئے تو بیرا غیر حاضر پایا۔ اگلی صُبح غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو بولا:

"ماسٹر نے خود ہی تو کہا تھا کہ نہیں آئے گا۔"

ہمیں اب معلوم ہوا کہ کمبخت مارے ادب کے ہمارے لیے صیغۂ حاضر کی بجائے غائب استعمال کر رہا ہے اور یہ کہ ماسٹر سے مراد ہم خود ہی ہیں لیکن وُہ سکول والے ماسٹر نہیں، بلکہ آقائے ولی نعمت قسم کے۔ ہمیں انگریزی زبان کی کم مائیگی پر رحم آیا کہ بڑی مہذّب اور شائستہ بنی پھرتی ہے لیکن کسی کو تعظیم سے مخاطب ہی نہیں کیا جا سکتا اور اپنی اُردُو پر پیار آیا جس نے لفظ "آپ" ایجاد کر کے بے ادبی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ خواہ ظلِّ سُبحانی ہی کیوں نہ مخاطب ہوں، بالمشافہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ غالباً مغربی زبانوں میں 'آپ' کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

چنانچہ ہمارا مدراس کا قیام تو نہ گرامر کی رُو سے خوشگوار تھا، نہ عام بود و باش کے اعتبار سے۔ مثلاً راہ چلتے ہوئے آپ کو ایک معزّز آدمی سوٹ ٹائی پہنے ہوئے ہے لیکن نیچے پاؤں سے ننگا ہے۔ آپ اس بے ربطی پر حیران ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ مَرد کون ہو سکتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ موصوف مسخرے نہیں ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اگر آپ بڑھ کر اُن سے اسمِ گرامی پُوچھتے ہیں تو حضور فرماتے ہیں:

"یم۔ یف۔ یندرم" اگرچہ حقیقت میں ہز لارڈشپ کا مطلب ہے۔ ایم۔ الف۔ اِندرم!

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اور اندازِ گفتگو یہ ہے کہ مدراس میں الف اگر کسی لفظ کے شروع میں آنے کی گُستاخی کرے تو اُسے 'ی' بنا دیا جاتا ہے۔ ہمیں مدراس اور بنگلور میں کوئی ہفتہ بھر ہنس کر یا رو کر گزارنا تھا وُہ گزارا اور آخر ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو پشاور کے اسٹیشن پر فرنٹیئر میل سے اُترے۔

معاً ہمیں چھ سال پہلے کا پشاور آنا یاد آیا۔ اُس وقت ہم کچّی کلی کی مانند دو دن کے نرم و نازک سے نیم لفٹین تھے اور اپنے انگریز استقبال کنندوں کی سرد مہری سے کملا سے گئے تھے لیکن اب ہم میجر تھے اور خیال تھا کہ ذرا خرانٹ بھی ہیں۔ آخر دو محاذوں پر جنگ لڑ کر آئے تھے۔ چھاتی پر اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے تمغوں کی پوری

ڈیڑھ قطار تھی۔ انگریزوں میں رہ کر انگریزی عادات اور خرافات پر بھی اب خاصا عبور تھا۔ استقبال کے لیے اِس دفعہ بھی ایک انگریز میجر آیا لیکن ہمیں محسوس تک نہ ہوا کہ گورا ہے یا کالا۔ منٹوں میں ہیلو اولڈ بوائے سے گزر کر چند ناقابلِ تحریر کلمات سے تعارف کی منزلیں طے کر ڈالیں اور جب سروسز ہوٹل میں ایک کمرے میں اپنا سامان اُتارا تو میجر مور ہمارے بے تکلّف یار تھے۔

دُوسرے روز یونٹ میں جانے کا ہمارا پہلا دِن تھا۔ ہمارے ایما پر دھوبی نے ہماری وردی کو اکڑایا، بیرے نے پھُولوں کو چمکایا، ہم نے سینے کو پھُلایا، ٹھوڑی کو اُٹھایا، شِکم کو پچکایا اور اپنے نئے یونٹ کو روانہ ہوئے۔ ہمیں خیال تھا کہ یونٹ کے دروازے پر کوارٹر گارڈ ہو گی۔ ہم بحیثیت فیلڈ افسر اس کی سلامی لیں گے اور کور کمانڈر صاحب سے ملاقات ہو گی لیکن جہاں ہمارے رہنما نے کار روکی وہاں کوارٹر گارڈ کا نشان تک نہ تھا بلکہ مجلسِ قانون ساز کی عمارت تھی۔ اتنے میں ایک مزری پوش جوان آگے بڑھا اور کار کا دروازہ کھول کر بولا:

"پہ خیر راغلے۔"(خوش آمدید)

ہم نے کہا: "ہم یہاں نہیں آئے۔ ہمیں فرنٹیئر کور جانا ہے۔"

بولا "ہم دغہ دے۔"(وہ یہی تو ہے۔)

حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ہیڈ کوارٹر کے لوازمات کیا ہوئے؟ نہ کوارٹر گارڈ ہے، نہ سنتری، نہ اٹن شن، نہ سلیوٹ، یہ کیسی فرنٹیئر کور ہے؟ آگے دفتر کے اندر گئے تو سب فوجی افسر سُوٹ پہنے، ٹائیاں لگائے بیٹھے تھے۔ گویا اسمبلی کے ممبر ہیں۔ ہمیں دیکھا تو سب نے ایک متحدہ قہقہہ لگایا اور میجر مور جو اُن میں سے ایک تھے، ہمیں مخاطب کرتے ہوئے پریڈ گراؤنڈ کے انداز میں بلند آواز سے بولے:

"سٹینڈ ایٹ اِیز۔ سٹینڈ اِیزی۔"

جواباً ہم نے صُبح کا روکا ہوا سانس خارج کیا۔ ٹھوڑی کو حسبِ منشا لٹکنے کی اجازت دی۔ شِکم کو حدِّ امکان تک پھیلنے کی رُخصت دی اور اُن کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ معلُوم ہوا کہ فرنٹیئر کور کا ہیڈ کوارٹر سفید پوشوں کا ادارہ ہے۔ وردی صرف قبائلی علاقے میں سکاؤٹ اور ملیشیا کے یونٹوں میں پائی جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر فقط چار پانچ افسروں پر مشتمل تھا جن کے دفتر کے لیے صوبائی اسمبلی[۶۹] کی عمارت سے تین چار کمرے اُدھار پر لیے گئے تھے۔

---

۶۹ یہ دو سال بعد کی بات ہے کہ فرنٹیئر کور کا دفتر بالا حصار میں منتقل ہُوا جہاں ہم پہلے آباد کاروں میں سے تھے۔

اُس زمانے میں فرنٹیئر کور پر انگریز افسر قابض تھے۔ دیسی افسر کوئی ایک آدھ ہی لیا جاتا تھا اور ہزار مُشکل سے۔ بلکہ اگر یہ بھی خاندانی واسطوں اور پُرانے افسروں کی سفارش پر لیے جاتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ لیے جانے کے بعد بقول شخصے لاٹ کے بچّے بن جاتے تھے اور باقی افسروں کو عوام سمجھے لگتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ یہاں آ کر تنخواہ میں چار سو روپے کا اضافہ ہو جاتا تھا بلکہ قبائلی معرکوں کے انگریز نامہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے سکاؤٹ اور ملیشیا کی زندگی کو ایک گہرا افسانوی رنگ دے رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب پیچھے ہوم کو کھائبر پاس (درّہ خیبر) شہور تنگی، فقیر اپی اور دُوسری قبائلی جنگوں کے اصلی اور فرضی قصّے لکھ کر بھیجتے تو انگریز مائیں اور معشوقائیں سمجھتیں کہ بیٹا یا محبوب لارنس آف فرنٹیئر ہو گیا ہے اور یہ مغالطہ خود انگریز افسروں کو بھی خاصا موافق آتا۔

ویسے قبائلی سنگستانوں کی زندگی میں کسی قدر رومان اور افسانے کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے تقرّر کے کاغذات پیش کیے تو ہمیں اپنی خوش نصیبی سے بالتفصیل آگاہ کیا گیا۔ یوں جیسے ٹونی آر مسٹر انگ کی طرح ہمارا بھی شاہی خاندان میں رشتہ ہو گیا ہے۔

کرنل ہیریسن کو تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ کسی اور کے اشارے کے بغیر میں فرنٹیئر کور کے قابل سمجھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ رہ نہ سکا تو ہم سے رازدارانہ لہجے میں پُوچھنے لگا۔

”یہ کھپلا کیسے لگا؟“

اب ہم فرنٹیئر کور میں آئے تو اس وجہ سے تھے کہ اس اسامی پر بہر طور کسی دیسی کو ہی آنا تھا اور یہ محض اتّفاق تھا کہ وُہ دیسی ہم نکلے۔ لیکن کرنل ہیریسن کے جواب میں ہمارے سامنے گپ لگانے کے لیے لامحدود میدان تھا۔ ہم نے سنجیدگی سے کہا:

”مجھے خُود سمجھ نہیں آتی سوائے اِس کے کہ برما میں لارڈ مونٹ بیٹن سے ایک ملاقات میں فرنٹیئر کور کا ذکر آیا تھا۔“

ہمارا یہ کہنا تھا کہ کرنل صاحب جھَٹ بول اُٹھے:

”THAT IS IT“[70]

بھولے کرنل صاحب! مونٹ بیٹن سے ملنا تو درکنار، ساری جنگ میں ہمارا اور مونٹ بیٹن کا درمیانی فاصلہ بھی تین سو میل سے کم ہی نہ رہا تھا، لیکن اب حکایت شروع ہو چکی تھی اور ہم سے ملاقات کی تفصیل کے لیے اصرار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے مناسب کسرِ نفسی مگر خاصے نامناسب مبالغے کے ساتھ ایک دلکش سا افسانہ پیش کیا۔ مونٹ بیٹن کے ساتھ بے تکلّفی کا قِصّہ سنایا تو انگریز سامعین سہم سے گئے۔ گویا کہہ

---

۷۰ یہی تو بات ہے۔

رہے ہوں:

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

قِصّہ مختصر دفتر بند ہونے سے پہلے ہمیں نہ صرف فرنٹیئر کور کی برادری میں لے لیا گیا بلکہ ہماری اچھّی خاصی دستار بندی بھی کر دی گئی۔

دُوسرے روز بر گیڈ یئر ایمبروز (انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور) سے مُلاقات ہوئی۔ انگریز دورے کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہے۔ حسبِ توقع ہمیں حکم مِلا کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام ملیشیا اور سکاؤٹ یونٹوں کا دورہ کر لو، پھر کام شروع کرنا۔

اِس چھوٹے سے حکم کی تعمیل خاصی طویل اور ثقیل تھی۔ یعنی قبائلی علاقے کے طول و عرض میں کوئی تین ہزار میل کا جالا بُننا تھا۔ اِس وقت فرنٹیئر کور میں آٹھ دس یونٹ تھے جو شمال میں گِلگت سے لے کر جنوب میں چمن تک بِکھرے پڑے تھے۔ اگر پی آئی اے کے نقشہ ساز ہمارے سفر کا نقشہ دیکھ لیں تو رشک کے مارے اپنے ڈیسک پر ہی کریش(CRASH)ہو جائیں۔

اِس سفر میں چند روایتی صعوبتیں ضرور تھیں لیکن قبائلی تواضع اور کیپٹن مومن شاہ کی رفاقت نے انہیں سر نہ اُٹھانے دیا۔ مومن شاہ ہمارے نائب تھے۔ قد کے چھوٹے

ہونے کے بعد ذرااور بھی چھوٹے تھے۔ یہی کوئی پانچ فٹ صفر انچ۔ لیکن دِل کے بڑے ڈبل پٹھان تھے۔ یعنی وُہ چند خوبیاں جو اور پٹھانوں میں فرداً فرداً ملتی ہیں ان میں یکجا تھیں۔ شریف مگر غضّیل، مہمان نواز مگر تشنہ انتقام، جاں نثار مگر زود رنج۔ اِن خالص پختون عادات کے علاوہ ایک عادت بہادر سِکھ دوستوں سے بھی مُستعار لی تھی۔ یعنی کوئی کام ہو، مستعدی سے کرڈالتے تھے اور پھر آرام سے سوچتے رہتے تھے کہ کیسے کرنا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ آپ سلیکشن بورڈ کے سامنے گئے۔ آپ کو دیوار "الف" سے دیوار "ب" پر دو زینوں کی مدد سے زمین کو چھوئے بغیر پہنچنا تھا۔ کوئی ستر فٹ کا فاصلہ تھا اور زینوں کے استعمال میں تھوڑی سی چالاکی درکار تھی۔ اب سیدھے سارے پٹھان کو چالاکیوں سے کیاواسطہ ؟ آپ نے اللہ کا نام لیااور دیوار "الف" سے براہ راست دیوار "ب" کے لیے چھلانگ لگا دی۔ بعد میں اگر آپ کی ٹانگوں کو کوئی آنچ نہ آئی تو یہ آپ کا قصور نہ تھا۔ یہ پٹھان ٹانگوں کا عدم تعاون تھا۔ ہفتہ گزر چُکا تو کہنے لگے:

"یاراوُہ زینہ دُوسرے زینے میں پھنسا لیتا تو سیڑھی سیڑھی دیوار "ب" تک پہنچ سکتا تھا۔"

آپ کا ہفتے کے بعد بھی اِتنا سوچنا غنیمت تھا۔ کیونکہ عام حالات میں آپ کی دو سوچوں

کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا تھا۔ لیکن کیپٹن مومن شاہ کی یہی سادگی اور صاف باطنی ہی تو تھی جس نے ہمارا دِل موہ لیا۔ وُہ نہ صرف اپنی خوبیوں بلکہ خامیوں کی وجہ سے بھی پیارے لگتے تھے۔ وُہ صحیح معنوں میں ہمارے خانۂ دِل کے مکین تھے اور آج تک وہیں رہتے ہیں۔

دورے کی ابتدا لنڈی کوتل سے کی۔ جاتے ہوئے درّہ خیبر سے گُزرے جس سے ہمارا پہلے بھی تعارف ہو چکا تھا لیکن گزشتہ کچھ سالوں میں درّہ خیبر نے جنگ کی اِس قدر تیاری کر لی تھی کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ سڑک پر جابجا روڈ بلاک رکھے تھے۔ نیچے نالے میں ٹینکوں کی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ یوں جیسے کنکریٹ کی کھمبیاں اُگ آئی ہوں۔ اب تو سچ مُچ درّہ خیبر سے گھٹا بچ کر نکلتی تھی اور ہوا تھرّا کے چلتی تھی۔ لیکن ہمارا مُعاملہ ہوا سے ذرا مختلف تھا۔ ہم فرنٹیئر کور کے افسر تھے اور درّہ خیبر کے سگے رکھوالے، سو بے باکانہ سینہ ابھار کر چلے۔

لنڈی کوتل پہنچے تو جس کوارٹر گارڈ کے معائنے اور سلامی کا انتظار یا اشتیاق تھا موجود پائی۔ فارغ ہوئے تو انگریز کرنل سے تبادلۂ خیالات ہوا اور محسوس ہوا کہ جب اس نے ہمیں چائے پیش کی تو خود خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ کیونکہ فرنٹیئر کور میں دو دیسی افسروں کے آنے کا یہ مطلب تھا کہ سلطنت۔برطانیہ

کے کم از کم دو سو مربع میل پر سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے۔[1] کیپٹن مومن شاہ نے تو کرنل صاحب سے یہ سوال بھی پوچھ لیا کہ ”کرنل صاحب آپ اپنا فیملی ولایت کب بیجے (بھیجے) گا۔ اِدھر تو اب گرمی آنے والا ہے۔“ اُس وقت اگر کوئی کرنل صاحب کو تھرمامیٹر لگاتا تو تھرمامیٹر کھول اٹھتا۔ کرنل صاحب کی گرمیاں آچکی تھیں!

لنڈی کوتل سے پاراچنار گئے۔ کوہاٹ اور تھل کے سنگستان سے گزر کر دریائے کرم کی وادی میں داخل ہوئے تو ہم پر اس مقام کا راز کھلا جہاں اقبال حُسنِ بے پرواہ کو بے حجاب دیکھ کر اِس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ہوں اگر شہروں سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟ پاراچنار کا حُسن کشمیر سے بھی زیادہ بے آلائش ہے۔ ہم نے پورے تین دن کرم ملیشیا اور اس کے کاروبار کا جائزہ لیا۔ آخر دورے کا بھی کچھ مقصد تھا۔ لیکن وہاں سے رخصت ہوئے تو حاصلِ دورہ کرم ملیشیا کے اعداد و شمار نہ تھے بلکہ رُخِ پاراچنار کے نقش و نگار، جو آج تک ذہن سے محو نہیں ہو سکے۔

پاراچنارے سنگینوں کے سائے میں بنّوں اور میر علی کے راستے میراں شاہ پہنچے۔ وہی

---

[1] انگریزوں کا خوف بجا تھا۔ پانچ ماہ بعد ہی پاکستان وجود میں آگیا اور انگریز یا تو رخصت ہو گئے یا ہمارے خانہ زادوں میں شمار ہونے لگے۔

میر اں شام تھا۔ جہاں سے ہم نے چھ سال پہلے جنگی زندگی کی ابتدا کی تھی یا انگریزوں نے کرائی تھی کہ ایک دوسرا انگریز پشاور جا کر برِج کھیل سکے۔ اس وقت ہم نیم لفٹین تھے اور عالی دماغ میر اں شاہ کو ہماری آمد و رفت کا احساس تک نہ تھا۔ اب میر اں شاہ کے قلعے میں قدم رکھا تو ٹوچی سکاؤٹس کے کمان افسر کرنل سینڈیسن خود خیر مقدم کو آئے اور میر اں شاہ نے تو گویا اپنا اعمال نامہ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور ہم نے بکمال فیاضی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے۔

قبائلی سرداروں کو ہماری آمد کا عِلم ہوا تو ہم تواضع کے ہاتھوں محصور ہو گئے۔ وہ صوبیدار میجر سے لے کر سپاہیوں تک کی طرف سے دعوتیں، وُہ پیٹ بھر جانے پر ہمارا مزید کھانے سے اِنکار اور میزبان کا فقد ایک سالم دُنبہ اور کھلانے پر اصرار، وُہ رات کو جوانوں کا بُلبُلہ [۴۲] اور دن کو زبانوں کا زلزلہ [۴۳]۔

۔۔۔ دُوسرے روز دفتر میں کرنل صاحب سے تعلیمی معاملات پر بحث ہوئی تو ہمارے عِلم و فن سے بہت مرعوب ہوئے۔ لنچ کے وقت میس میں شکار کا ذکر چل نِکلا تو مختلف پرندوں کے نام لیے جانے لگے۔ اِس ضمن میں کرنل سینڈیسن ایک پرندے کا اُردُو نام

---

۴۲ بلبلہ پشتو میں رقص و سرور کی محفل کو کہتے ہیں۔

۴۳ ہمارے کان پشتو سے تازہ تازہ آشنا ہو رہے تھے۔

پوچھ بیٹھے جسے انگریزی میں بسٹرڈ(BUSTARD) کہتے ہیں۔ اس خاکسار کا عِلم و فن جواب دے گیا اور لاعلمی کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ مومن شاہ نہایت آرام سے کسی قدر عالمانہ انداز میں بولے:

"اردو میں اسے ناجائز اولاد کہتے ہیں۔"

کرنل سینڈیسن اُردُو سے خاصے آشنا تھے۔ ہماری سخن فہمی اُن پر آشکارا ہوئی تو مضمون بدل کر موسم کی بات کرنے لگے۔ حسبِ معمول کوئی مہینہ بھر بعد کیپٹن مومن شاہ ہنس کر کہنے لگے۔

"یار اوُہ بسٹرڈ کے معنی خوُہ ٹیک (ٹھیک) نہیں تھے۔ یہ داؤس تو پرندہ ہوتا ہے۔"

میران شاہ کے بعد ہماری منزل جنڈولہ تھی۔ پہنچے تو شام کا وقت تھا۔ شام کے دُھندلکے میں جنوبی وزیرستان کے کوہ و دمن خیبر سے بھی زیادہ دِلکش نظر آتے ہیں۔ وہی عظمت اور وہی شانِ دلآویزی، لیکن بہت بڑے پیمانے پر۔ ہمارے دِل نے اِس کشش کی شدّت محسوس کی۔ جنڈولہ کے قلعے میں داخل ہوئے تو اس کے صحن میں سبز گھاس پر دس بارہ انگریز افسر بیس بائیس مختلف النسل کتّوں کے دائرے میں آرام کرسیوں پر بیٹھے پی رہے تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھا تو خیر مقدم کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ انگریز نہیں کتّے! اور گرم جوشی مگر خاموشی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔۔ اچھّے انگریز

اپنے کتّوں کو بھونکتا دیکھیں تو اُنہیں جنگلی کہتے ہیں اور اچھّے کتّے اِس نکتے سے آشنا ہیں۔ لہٰذا اوّل تو بھونکتے ہی نہیں اور ایمر جنسی میں کچھ کرنا ہی پڑے تو بقول پطرس بھی ہلکی سی بُخ کر دیتے ہیں۔

انگریزوں کے قریب پہنچے تو انہیں اپنے کتّوں سے بھی زیادہ کم گُو پایا۔ لیکن اُن کی کم گوئی تہذیب کا تقاضا نہ تھا بلکہ جلاپے کا اظہار تھا۔ اِس قلعے میں آج تک کوئی غیر انگریز داخل نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ بیرا ہو یا اردلی۔ اور آج یہ مقدس روایت جنڈولہ کی نرم و نازک گھاس کے ساتھ پامال ہو رہی تھی۔ ایک انگریز میجر نے بصد مُشکل کیپٹن مومن شاہ کو پشتو میں کچھ کہنے کی زحمت گوارا کی کہ اپنے بیر وں، خانساموں سے بولنے کا یہی انگریزی دستور تھا۔ کیپٹن مومن شاہ نے نہایت شُستہ انگریزی میں جواب دیا:

WOULD YOU MIND SAYING THE SAME THING IN ENGLISH? YOUR PUSHTO IS A LITTLE TOO GOOD FOR ME[74]

طوطے اُڑنے کا محاورہ سُن رکھا تھا۔ آج ہم نے طوطے اُڑتے دیکھے۔ انگریزی طوطے!

---

74 کیا آپ یہی بات انگریزی میں کہنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ آپ کی پشتو میری فہم سے ذرا بالا تر ہے۔

اِس کے بعد انگریزوں نے ہم پر حسبِ توقع دانت پیسے لیکن ادب اور قرینے سے۔

جنوبی وزیرستان کے قبائلی جوانوں کو جب عِلم ہوا کہ دیسی مسلمان افسر آئے ہوئے ہیں تو ہمیں مِلنے کے لیے بے تاب ہونے لگے۔ ہم نے یہ تقریب دُوسرے روز نمازِ جمعہ تک اٹھا رکھی اور جب سکاؤٹوں کی مسجد میں گئے تو سینکڑوں صحت مند اور کسرتی سکاؤٹوں کی شوخیٔ معانقہ کے بعد پسلیاں نقشِ فریادی بن کر رہ گئیں۔ اور "جوڑ تکڑا۔ ڈیر تکڑا" کی تکرار سے زبان بَل کھا کھا کر پیچدار کیل کی شکل اختیار کر گئی۔ قبائلی علاقے میں اخوّتِ اسلامی کا اظہار اچھّا خاصا جسمانی بلکہ پہلوانی معاملہ ہے۔ ملاقات کے جوش و خروش کے بعد جب ان لوگوں کی تعلیم کے متعلق استفسار کیا تو پتہ چلا کہ وزیرستان کی بارش کی طرح یہاں کی تعلیم کی اوسط بھی کوئی ایک انچ سالانہ کے لگ بھگ ہی ہے۔

الغرض یہی کیفیت ژوب ملیشیا (فورٹ سنڈے مین) اور پشین سکاؤٹس (چمن) میں نظر آئی۔ انگریز افسر ناخوش، پٹھان سپاہی خوش۔ عِلم کی قلّت۔ چِلم کی کثرت۔ معانقوں کی شدّت اور پسلیوں کی شامت۔ لیکن دُوسری طرف چترال اور گلِگت گئے تو اِن لوگوں کا مزاج کسی قدر مُختلف پایا۔ یہاں کا درجۂ حرارت اور درجۂ اخوّت دونوں مقابلتاً ملائم تھے۔ لوگ بامروّت تھے لیکن مروّت کے اظہار سے ہڈی پسلی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ چائے یہ بھی پلاتے تھے لیکن بڑی حلیم سی جو بیشتر زرد رنگ کا بے ضرر سا شِیر

گرم پانی ہوتا تھا جسے بڑی تواضع سے پیش کرتے تھے۔ وُہ درّہ کوہاٹ والا اُبلا ہوا سیاہ لاوا نہ تھا جو جنابِ میزبان ہزار پیوند پیالیوں میں کم و بیش ڈنڈے کے زور سے پلاتے تھے۔ اِن لوگوں کے چہروں سے خونخواری کی بجائے خاکساری ٹپکتی تھی۔ رہی تعلیم تو وُہ یہاں بھی اتنی ہی تنگڑی تھی جتنی خیبر اور وزیرستان میں۔

آخر سرحد پیمائی ختم ہوئی تو کوئی مہینہ بھر بعد ہم پشاور لوٹے۔ اب ہمارا کام فرنٹیئر کور کے ہمہ تن کورے جوانوں کے لیے ایک اعلیٰ منصوبہ تیار کرنا تھا۔ حقیقت میں ایسے اہم کام کے لیے تو لارڈ میکالے یا مسٹر شریف کی ضرورت تھی۔ بھلا ہم خاک نشین سپاہیوں کو تعلیمی اصلاحات سے کیا رشتہ؟ لیکن حکم حاکم تھا اور ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ہماری قابلیت کے مقابلے میں کام اگرچہ مُشکل ہے لیکن ہے کرنے کے قابل۔ لہٰذا ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس محنت سے کام لیا جسے شاقہ کہتے ہیں اور قبائلی جوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنا تمام تر زورِ قلم بلکہ خونِ جگر صرف کر کے ایک سکیم بنا ڈالی۔ پھر پُورے جوش اور واجبی خروش کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور نتیجہ یہ رہا کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم خود جامے سے باہر تھے۔ خوشی سے نہیں، پسینے سے! بالغ کو پڑھانا یوں بھی مُشکل کام ہے۔ لیکن بالغ بھی ہو اور پٹھّان بھی تو پھر یہ کام کسی مُشکل کشا کے بَس کا ہی ہوتا ہے۔ ہم یوں تو کچھ نہ تھے لیکن غلام مُشکل کشا ضرور تھے۔ اللہ کا نام لیا اور خیبر سے لے کر چمن تک قبائلی سپاہیوں پر درِ علم

وا کر دیا۔

یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ہمارے تیار کردہ زیورِ تعلیم نے قبائلی زندگی میں کیا آراستگی پیدا کی ہمارے لیے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ہماری سکیم آج تک رائج ہے اور کیپٹن مومن شاہ اور ہم کبھی کبھی چُپکے سے ایک ناروا سا فخر بھی کر لیتے ہیں کہ شاید:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ اور بات ہے کہ جریدہ عالم کا قبائلی صفحہ کسی کی نظر سے گزرے گا یا نہیں۔ لیکن قاری محترم، اس فخر تعلّی کا گمان زنہار نہ کیجئے گا۔ ہم نے زندگی میں اگر کوئی جاندار کارِ خیر کیا ہے تو وُہ یہی ہے اور عاقبت میں ہمارے پاس کچھ اثاثہ ہو گا تو یہی سکیم ہو گی۔ گویا یہی ہماری مسدس حالی ہے۔۔۔۔ ہاں ایک اجر ہمیں اِسی دُنیا میں فوری طور پر بھی مِل گی یعنی پشتو سیکھ لی اور ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پشتو بولنا بھی کس قدر مقوّی ٹانک (TONIC) ہے۔ ھَو کنہ؟

اُن دنوں مُلک میں ایک سیاسی انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ قائد اعظم اور پنڈت نہرو دِلّی میں لارڈ مونٹ بیٹن سے مِل کر انگریزی راج کا قِصّہ تمام کر رہے تھے اور اُڑتی سی خبر تھی کہ مُلک آزاد ہونے والا ہے۔ اور اچانک ہمیں حُکم مِلا کہ ۶ جون ۱۹۴۷ء کو ریگولر کمیشن کے امتحان کے لیے سلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے حاضر ہو۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو

رات کی گاڑی سے جانا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اُسی روز ہمارے سیاسی رہنما آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں۔ چنانچہ دوپہر سے ہی ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئے۔ پہلے مونٹ بیٹن بولے، پھر پنڈت نہرو اور اُن کے بعد قائداعظم۔ ہم نے ابھی تک قائداعظم کی تقریریں صرف اخباروں میں ہی پڑھی تھیں لیکن آج پہلی مرتبہ اُن کی پُر شکوہ آواز سُنی تو ہمارے سینوں میں توانائی آنے لگی اور اپنے قائد پر بے حساب فخر محسوس ہوا۔ لیکن قائد کی آواز سے بھی زیادہ نشاط انگیز وُہ مژدہ تھا جو اُن کی تقریر کا موضوع تھا۔ یعنی یہ کہ دو ماہ بعد ۱۴ اگست کو پاکستان قائم ہونے والا تھا۔

اِس ایک پیام سے ہماری تو دُنیا ہی بدل گئی اور فوراً اپنے آپ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اب میرٹھ جاکر یعنی ایک غیر مُلک میں ریگولر کمیشن لینے کے کیا معنی؟ کیوں نہ پاکستان بن لے اور خالص پاکستانی امتحان میں شرکت کریں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ابھی دو ماہ تک انگریز کا راج ہے لہٰذا انگریزی امتحان ہی دینا پڑے گا۔ چنانچہ ناچار اِسی رات میرٹھ روانہ ہوئے۔ میرٹھ میں امتحان سے فارغ ہو کر پشاور لوٹے تو اپنے ساتھ ریگولر کمیشن کے علاوہ اپنا پرانا دوست ٹانسلائیٹس بھی لے آئے۔ دو ہفتے بعد پشاور کے ملٹری ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو انگریز نرس نے (جس نے چوری چھپے ہمارے خطوط پڑھنے کے علاوہ یاد بھی کر لیے تھے) ہمیں مَری میں گرمیاں گزارنے کا مشورہ حکم اور دھمکی ملا جلا کر دینے اور سٹاف سرجن کے کان میں ایک ایسی چبھتی سی سرگوشی کی کہ

غریب نے فی الفور ہمارے لیے چھٹّی کی سفارش کر دی اور خود ہفتہ بھر کان میں گلیسرین ڈلواتا رہا۔۔۔چند روز بعد ہم مری میں تھے۔

سیسل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۱۲۶ ایک منکسر مزاج سا سِنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لیے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی کمرے میں ہم پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صُبح طلوع ہوئی۔ اِسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سُنا۔ گویا اِسی کمرے میں وطنِ عزیز کی آزادی کی ابتدا ہوئی۔ مگر اسی کمرے میں اپنی آزادی کا خاتمہ بھی ہوا۔ یعنی وُہ خاتُون جو اُس شب ہمارے ساتھ شریک بزم تھی، دُوسرے روز شریک حیات بن گئی اور وُہ آزاد رو نیم لفٹین کہ قاہرہ سے لے کر مانڈلے تک عِشق کی دسترس سے محفوظ رہا تھا؛ مری پہنچ کر اسیر اُلفت ہو گیا۔

بڑی مُدّت کے بعد آخر وُہ شاہیں زیرِ دام آیا

اور یہاں سے ایک دُوسری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔